الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اللہ کی نظر میں قیمتی ٹھہریں
تو اپنی نظر میں اپنے آپ کو بے قیمت کر لیجئے

ستمبر ۱۹۸۵
شمارہ ۱۰۶

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	30/-	ایمانی طاقت	4/-
تذکیر القرآن جلد اول	80/-	اتحادِ ملت	3/-
الاسلام	25/-	سبق آموز واقعات	3/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-	زلزلۂ قیامت	5/-
ظہورِ اسلام	25/-	حقیقت کی تلاش	3/-
احیاءِ اسلام	20/-	پیغمبر اسلام	2/-
پیغمبرِ انقلاب	25/-	حقیقتِ حج	4/-
سوشلزم اور اسلام	25/-	آخری سفر	3/-
صراط مستقیم	25/-	اسلامی دعوت	3/-
اسلامی زندگی	20/-	خدا اور انسان	3/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-	حل یہاں ہے	3/-
دین کیا ہے	3/-	سچا راستہ	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-	دینی تعلیم	3/-
تجدید دین	4/-	حیاتِ طیبہ	3/-
اسلام دینِ فطرت	3/-	باغِ جنت	3/-
تعمیرِ ملت	3/-	نارِ جہنم	4/-
تاریخ کا سبق	4/-	تبلیغی تحریک	1,2/-
مذہب اور سائنس	5/-	دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عقلیاتِ اسلام	3/-	عقل کا فیصلہ	
فسادات کا مسئلہ	2/-	کاروان اسلام	
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-	رازِ حیات	
تعارفِ اسلام	3/-		
اسلام پندرھویں صدی میں	3/-		
راہیں بند نہیں	3/-		

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

ستمبر ۱۹۸۵ □ شمارہ ۱۰۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا ذکر	۲
کائناتی وحدت	۳
انسان کی کمائی	۴
ہجرت حبشہ	۵
منفی ذہن	۶
حدیث تجدید	۷
ایک واقعہ	۸
جوہری فرق	۹
مانگنا	۱۰
مزاج دعوت	۱۲
پچھلے انبیاء	۱۵
مقصدیت	۱۶
متحدہ عمل	۱۷
انانیت	۱۸
شاعری	۱۹
جدید نسل	۲۰
تفریق کا سبب	۲۱
بے معنی بحثیں	۲۲
ناقص استدلال	۲۳
معیاری دنیا	۲۵
عملی حل	۲۶
ابتدائی تیاری	۲۷
جدید تہذیب	۲۹
امکانات	۳۰
واقفیت کی کمی	۳۲
اسلوب بیان	۳۳
عجیب لوگ	۳۴
ایک سفر	۳۶

قیمت فی پرچہ	۳ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دو سو روپے
بیرونی ممالک سے :	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لیے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے
بنک ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتقلی
AL-RISALA MONTHLY لکھیں

ماہنامہ الرسالہ
سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

اللہ کا ذکر

ذکر کے معنی یاد کے ہیں۔ اللہ کے ذکر کا مطلب ہے اللہ کی یاد۔ یہ یاد کوئی مصنوعی چیز نہیں وہ اللہ کی معرفت کا لازمی اور قدرتی نتیجہ ہے۔

جب کوئی آدمی اللہ کو اس کی عظمتوں اور قدرتوں کے ساتھ پاتا ہے تو اس کے اندر ایک روحانی ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ اس کو ہر وقت اللہ کی یاد آتی رہتی ہے۔ یہ یاد کبھی دل کے اندر تڑپ بن کر ظاہر ہوتی ہے اور کبھی زبان سے حمد اور شکر اور خشیت کے الفاظ کی صورت میں بے ساختہ نکل پڑتی ہے۔ اسی کیفیت کو اللہ کی یاد کہا جاتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اتھاہ خلا میں ستاروں اور کہکشاؤں کی حرکت پر غور کرتا ہے۔ وہ پکار اٹھتا ہے کہ وہ خدا بھی کیسا عظیم خدا ہوگا جو اتنے بڑے کارخانے کو اتنی صحت ساتھ متحرک کیے ہوئے ہے۔ کبھی وہ درختوں اور پہاڑوں اور دریاؤں کے پُرکشش مناظر کو دیکھتا ہے اور ان کے حسن اور معنویت کا ادراک کر کے حیران رہ جاتا ہے۔ آدمی کو اس کے گرد و پیش کی چیزیں بار بار اللہ کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ اس کے اندر اللہ کی یاد کو جگاتی رہتی ہیں۔

اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی حالت پر غور کرتا ہے تو اس کو اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بے تابانہ اپنے رب سے معافی مانگنے لگتا ہے۔ وہ خدا سے کہتا ہے کہ وہ اس کو آخرت کے عذاب سے بچائے۔ اور اس دن اپنی رحمتوں کے سایہ میں داخل کرے جب کہ خدا کی رحمت کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا جہاں آدمی پناہ لے سکے۔ کبھی آدمی اپنے عجز اور بے چارگی کو دریافت کرتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ خدایا تو قادر مطلق ہے تو اپنی قدرت سے میرے عجز کی تلافی فرما۔

انسان کے دل میں انہیں ربانی احساسات کا پیدا ہونا اور ان احساسات کا الفاظ کی صورت میں ڈھل جانا، اسی کا نام ذکر ہے۔ ذکر اللہ کی یاد ہے، سب سے بڑی حقیقت کی یاد۔ جو چیز سب سے بڑی حقیقت کی یاد ہو اس کا تجربہ بھی سب سے بڑا تجربہ ہوتا ہے۔ اس تجربہ کا کسی کے دل پر گزرنا اتنا بڑا واقعہ ہے جس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

کائناتی وحدت

کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ پوری کائنات ایک مرکز کے گرد گھوم رہی ہے۔ ایٹم کا ایک نیوکلیس ہے۔ اور ایٹم کا پورا ڈھانچہ اس نیوکلیس کے گرد گھومتا ہے۔ شمسی نظام کا مرکز سورج ہے اور اس کے تمام سیارے اور سیارچے مسلسل اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اسی طرح کہکشاں کا ایک مرکز ہے اور کہکشاں کے اربوں ستارے اس مرکز کے گرد حرکت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ پوری کائنات کا ایک مرکز ہے اور پوری پھیلی ہوئی کائنات اپنی ذیلی حرکتوں کے ساتھ اس آخری مرکز کے گرد حرکت کر رہی ہے۔

سائنس دانوں کا اندازہ ہے کہ یہ کائناتی مرکز ایک روز اپنے گرد کی تمام چیزوں کو کھینچنا شروع کرے گا اور پھر یہ ناقابل قیاس حد تک پھیلی ہوئی عظیم کائنات اپنے مرکز کی طرف سمٹنا شروع ہو گی اور بالآخر وہ وقت آئے گا کہ سارے کائناتی اجسام اس طرح سمٹ کر ایک مرکزی گولے کی صورت اختیار کر لیں گے۔ جیسے بکھری ہوئی کیلوں کے درمیان مقناطیس لایا جائے اور سب کیلیں سمٹ سمٹ کر اس سے جڑ جائیں ـــــ کما بدأنا اول خلق نعیدہ

اس طرح کائنات گویا دین توحید کا عملی مظاہرہ بن گئی ہے۔ وہ عمل کی زبان میں بتا رہی ہے کہ انسان کی زندگی کو کیسا ہونا چاہیے۔ انسان کی زندگی کو ایسا ہونا چاہیے کہ اس کی تمام سرگرمیوں کا صرف ایک مرکز ہو، اور وہ ایک خدا ہو۔ آدمی کے جذبات، اس کی سوچ، اس کی سرگرمیاں، اس کا سب کچھ خدا کے گرد گھومنے لگیں۔

آدمی اگر اپنی زندگی کا مرکز و محور اپنی ذات کو بنائے تو کائنات بزبانِ حال اس کو رد کر رہی ہے۔ اسی طرح اگر وہ اپنی ذات کے باہر کسی کو اپنی توجہات کا مرکز و محور بنائے تو موجودہ کائنات کے ڈھانچہ میں وہ قابل رد قرار پا رہا ہے۔ کائنات کا موجودہ ڈھانچہ ایک ہستی کے سوا کسی دوسرے کی مرکزیت کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔

کائنات زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ ـــــ "ایک" کو اپنا مرکز توجہ بناؤ نہ کہ ایک کے سوا "کئی" کو۔

انسان کی کمائی

ویوم یعرض الذین کفروا علی النار اذھبتم طیبا تکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بھا فالیوم تجزون عذاب الھون بما کنتم تستکبرون فی الارض بغیر الحق وبما کنتم تفسقون۔ (الاحقاف ۲۰)

اور جس دن انکار کرنے والے لوگ آگ کے سامنے لائے جائیں گے، تم اپنی اچھی چیزیں دنیا کی زندگی میں لے چکے اور ان کو برت چکے تو آج تم ذلت کا عذاب بدلے میں پاؤ گے اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق گھمنڈ کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ تم نافرمانی کرتے تھے۔

دنیا میں آدمی کو جو اسباب ملتے ہیں، مثلاً جسمانی طاقت، ذہانت، مال، عہدہ، وسائل اور مواقع یہ سب خدا کی طرف سے ہوتے ہیں۔ وہ اس لیے دیئے جاتے ہیں کہ ان سے آدمی اپنے لیے کمائی کرے۔

اس کمائی سے مراد نفسیاتی کمائی ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کو آیت میں کبر اور فسق کہا گیا ہے۔ دوسری کمائی وہ ہے جو اس کے برعکس ہے، یعنی تواضع اور شکر۔ آدمی اگر ان اسباب کو پاکر گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے۔ وہ ان کو ذاتی برتری حاصل کرنے کے لیے استعمال کرے۔ وہ ان کو شہرت اور لیڈری حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے، تو گویا کہ اس نے اپنے مواقع کو ضائع کر دیا۔ اس کو جو سامانِ عمل دیا گیا تھا اس کا انجام اس نے اسی آج کی دنیا میں لے لیا۔ ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

دوسرا آدمی وہ ہے جس کو اسباب حیات ملے تو اس نے ان کو خدائی چیز سمجھ کر اپنے عجز کا اقرار کیا، اس نے ان کو خدا کا عطیہ مان کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس نے ان اسباب کو اپنی ذات کے راستہ میں استعمال کرنے کے بجائے خدا کے راستہ میں استعمال کیا۔ یہ شخص وہ ہے جس نے ان مواقع کے ذریعہ آگے کا ذخیرہ فراہم کیا۔ اس نے اپنے دنیوی سامان کے ذریعہ آخرت کی کمائی کی۔ ایسا شخص موت کے بعد اپنے بہترین ذخیرہ کو پائے گا۔ اس کی کمائی جنت کے ابدی باغوں کی صورت میں اُس کی طرف لوٹا دی جائے گی ——— موجودہ زندگی میں ہر آدمی کو یکساں طور پر مواقع دیئے گئے ہیں۔ کوئی ان مواقع سے طیباتِ دنیا کما رہا ہے اور کوئی طیباتِ آخرت۔

ہجرت حبشہ

اسلام کی ابتدائی تاریخ کے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جس کو ہجرت حبشہ کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے پانچویں سال مکہ کے حالات بہت سخت ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کو طرح طرح سے ستایا جا رہا تھا۔ اس وقت آپ نے اپنے اصحاب کو مشورہ دیا کہ وہ عرب کو چھوڑ کر سمندر پار کے ملک حبشہ چلے جائیں۔

اس موقع پر روایات میں آپ کے جو الفاظ منقول ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

تفرقوا فی الارض۔ تم لوگ زمین میں بکھر جاؤ۔ اور

وان اللہ سیجمعکم بے شک اللہ عنقریب تم کو جمع کرے گا۔

اس موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بے حد بامعنی تھا۔ اس کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ ــــ دشمن کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس وقت تم اپنے آپ کو نشانہ سے ہٹا دو۔ اس کے بعد خدا کے قانون کے تحت خود ہی ایسے اسباب پیدا ہوں گے کہ دشمن زیر ہو اور تم زیادہ قوت کے ساتھ اپنے مقام پر مجتمع ہو سکو۔

ہجرت دراصل صبر کی ایک صورت ہے۔ اور خدا کا انعام ہمیشہ صبر کے باٹ سے تول کر دیا جاتا ہے۔

اعلم ان النصر مع الصبر جان لو کہ نصرت صبر کے ساتھ ہے۔ اور آسانی

وان مع العسر یسرا (حدیث) ہمیشہ مشکل کے بعد ملتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی مدد ہمیشہ صبر کرنے والوں کے حصہ میں آتی ہے۔ صبر، نصرت خداوندی کا زینہ ہے۔ جب بھی آدمی پر کوئی مشکل پیش آئے اور وہ ردعمل کا طریقہ اختیار نہ کرے بلکہ صبر کا طریقہ اختیار کرے تو یہ ایک بہترین علامت ہے۔ ایسے موقع پر صبر کی توفیق ملنا گویا اس بات کی پیشگی اطلاع ہے کہ آدمی کو خدا کی مدد حاصل ہوگی اور اس کی مشکل بالآخر آسانی اور کامیابی میں تبدیل ہو جائے گی۔

جنت صبر کے اُس پار ہے، مگر اکثر لوگ جنت کو صبر کے اِس پار تلاش کرنے لگتے ہیں۔

منفی ذہن

لینن (۱۹۲۴-۱۸۷۰) کا ابتدائی گھریلو نام ولادمیر ایلیچ الیانوف تھا۔ بعد کو وہ لینن کے انقلابی نام سے مشہور ہوا۔ لینن ایک ایسے گھر میں پیدا ہوا جو سیاسی انتہا پسندی کا مزاج رکھتا تھا۔ لینن کے بڑے بھائی الگزینڈر نے روس کے بادشاہ زار کو قتل کرنے کی ایک سازش میں حصہ لیا تھا۔ مگر یہ سازش ناکام ہوئی اور لینن کے بھائی کو ۱۸۸۷ء میں پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد لینن کا پورا خاندان مسلسل زار کی پولیس کے عتاب کا شکار رہا۔

محبوب بھائی کی پھانسی کا واقعہ لینن کے خون کو گرم کئے ہوئے تھا۔ زار سے نفرت اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ تاہم بھائی کے انجام کو دیکھ کر اس نے جان لیا تھا کہ شہنشاہ روس کو قتل کرنے کی انفرادی کوشش بے فائدہ ہے کوئی اجتماعی اور تنظیمی طاقت ہی اس کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ اور کارل مارکس کے نظریات کی صورت میں اس کو اپنی طلب کا جواب مل گیا۔

100 Great Modern Lives, by John Canning,
Century Books Ltd., London, 1972, p. 349

یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانہ میں لینن کو یہ موقع ملا کہ وہ کارل مارکس کے خیالات سے آگاہ ہو۔ اس کے بعد وہ مزید تعلیم کے لئے جنیوا گیا۔ وہاں اس کو کافی سوشلسٹ لٹریچر ملا۔ طبعی طور پر مارکس کے خیالات میں لینن کو بے حد دلچسپی ہوئی۔ مارکس کا فلسفہ نہ صرف لینن کے قابل نفرت دشمن (زار) کو پوری طرح غلط ثابت کر رہا تھا بلکہ وہ اس پورے نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کا جواز فراہم کر رہا تھا جس میں زار کو بڑائی کا مقام حاصل تھا۔ لینن کو مارکسی سوشلزم میں زار کے خلاف سیاست کے لئے فکری بنیاد مل رہی تھی۔ چنانچہ اس نے دل و جان سے اس کو قبول کر لیا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی ذاتی نفرت کے تحت عمل کرتا ہے۔ مگر وہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ محبت انسانی یا اطاعت خداوندی کے لئے متحرک ہوا ہے۔ آدمی کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔ وہ باہر سے ایک طرح کا انسان دکھائی دیتا ہے اور اندر سے بالکل دوسری طرح کا انسان ہوتا ہے۔ اس کا فکر محض ردعمل ہوتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اس کا فکر مثبت طور پر بنا ہے۔

حدیث تجدید

ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علیٰ رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا	اللہ اس امت کے لئے ہر سو سال کے سرے پر کسی کو بھیجے گا جو اس کے دین کی تجدید کرے گا۔
ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علیٰ رأس کل مئۃ سنۃ من یجدد لھا امر دینھا	اللہ اس امت کے لئے ہر سو سال کے سرے پر کسی کو بھیجے گا جو اس کے معاملہ کی تجدید کرے گا۔
ان اللہ یبعث علیٰ رأس کل مئۃ سنۃ من یجدد لھذہ الامۃ امر دینھا	اللہ ہر سو سال کے سرے پر کسی کو بھیجے گا جو اس امت کے دینی معاملہ کی تجدید کرے گا۔
ان اللہ عزوجل یبعث لھذہ الامۃ علیٰ رأس کل مئۃ سنۃ رجلا یقیم لھا امر دینھا	اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر سو سال کے سرے پر ایک شخص کو بھیجے گا جو اس کے لئے اس کے دینی معاملہ کو درست کرے گا۔
ان اللہ یمن علی اھل دینہ فی رأس کل مئۃ سنۃ برجل من اھل بیتی فیبین لھم امر دینھم	اللہ ہر سو سال کے سرے پر اپنے دین کے لوگوں پر میرے اہل بیت کے ایک آدمی کے ذریعہ احسان کرے گا۔ وہ ان کے لئے ان کے دین کے معاملہ کو بیان کرے گا۔

(دعوۃ الحق، الریاط، ربیع الاول ۱۴۰۵ھ)

تجدید دین کی روایت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ جس طرح حدیث کی کتابوں میں آئی ہے اس کو ہم نے اوپر نقل کر دیا ہے۔ ان کو ملا کر دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ "تجدید" دراصل "تبیین" کے ہم معنی ہے۔ تجدید دین سے مراد ہے دین کو خالص صورت میں بیان کر دینا۔

چوں کہ اس دین کو قیامت تک کے لئے باقی رہنا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام فرمایا کہ ہر صدی میں کم از کم ایک ایسا شخص پیدا ہوتا رہے جو لوگوں کے سامنے دین کو اس کی صحیح اور بے آمیز صورت میں بیان کر دے۔ وہ حق کو ناحق سے جدا کر دے تاکہ جس کو پانے کی طلب ہے وہ پالے۔ اور جس کو پانے کی طلب نہیں ہے اس کا غیر طالب ہونا ثابت ہو جائے۔

ایک واقعہ

جنگ جمل (۳۶ھ) میں ایک طرف حضرت علی اور ان کے ساتھی تھے جن کی تعداد تقریباً ۲۰ ہزار تھی۔ دوسری طرف حضرت زبیر بن العوام وغیرہ تھے جن کے ساتھ تقریباً ۳۰ ہزار کا لشکر جمع تھا۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے حضرت علی اور حضرت زبیر اپنی اپنی صفوں سے نکلے اور دونوں لشکروں کے درمیان میدان میں آئے۔ دونوں اتنے قریب آگئے کہ ان کے گھوڑوں کے منہ آپس میں مل گئے۔

حضرت علی نے حضرت زبیر سے کہا، کیا تم کو وہ دن یاد ہے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تم سے کہا تھا کہ تم ایک شخص (علی) سے لڑو گے اور تم اس پر ظلم کرنے والے ہوگے۔ یہ سن کر حضرت زبیر نے کہا، "ہاں مجھ کو یاد آگیا۔ آپ نے میری روانگی سے پہلے مجھ کو یہ بات کیوں نہ یاد دلائی۔ ورنہ میں مدینہ سے نہ نکلتا۔ خدا کی قسم اب میں تم سے ہرگز نہ لڑوں گا۔"

یہ کہہ کر حضرت زبیر اپنے آدمیوں کی طرف واپس آگئے۔ ان کے لڑکے عبد اللہ بن زبیر کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو ان کو پسند نہ آیا کہ ان کے والد میدان جنگ سے واپس چلے جائیں۔ انھوں نے اپنے باپ سے کہا "آپ نے جب دونوں فریقوں کو میدان میں اکٹھا کر دیا اور ایک دوسرے کی عداوت پر ابھار دیا تو اب چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں۔ مجھ کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ علی کے لشکر کو دیکھ کر ڈر گئے۔ آپ کے اندر بزدلی پیدا ہوگئی۔"

اس طرح کی اور باتیں ہوئیں۔ تاہم حضرت زبیر میدان جنگ میں نہیں ٹھہرے۔ وہ وہاں سے خاموشی کے ساتھ واپس روانہ ہوگئے۔ مگر ایک شر پسند (عمرو بن الجرموز) نے آپ کا پیچھا کیا۔ ایک مقام پر جب کہ آپ نماز میں مشغول تھے، عین حالت سجدہ میں آپ کو قتل کر دیا۔

حضرت زبیر ایک صحابی تھے۔ وہ یقینی طور پر ایک مخلص اور بہادر انسان تھے۔ اس کے باوجود ان پر "بزدلی" کا الزام لگایا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ الزام ایک ایسی چیز ہے جس کی نہ کوئی حد ہے اور نہ اس کا کوئی روک۔ خدا کا ایک بندہ وہاں چلنے سے رکتا ہے جہاں چلنے سے منع کیا گیا ہے اور اس کو پست ہمت قرار دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو وہاں لڑائی سے باز رکھتا ہے جہاں ایک بندہ خدا کے لئے لڑنا جائز نہیں۔ مگر کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ شخص لوگوں کو بزدلی کا سبق دے رہا ہے۔

جوہری فرق

واذا تتلی علیھم آیاتنا قالوا قد سمعنا لو نشاء لقلنا مثل ھذا ان ھذا الا اساطیر الاولین (الانفال ۳۱)

اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا۔ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ تو صرف پچھلوں کے قصے ہیں۔

اس آیت کے شان نزول میں کہا جاتا ہے کہ قدیم مکہ میں ایک شخص نضر بن حارث تھا۔ وہ تجارتی مقصد سے فارس جاتا تھا۔ وہاں بادشاہوں کے قصے اور رستم اور اسفندیار کی داستانیں سنتا اور واپس آکر مکہ والوں کو سناتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو آپ لوگوں کو قرآن پڑھ کر سنانے لگے۔ نضر بن حارث قرآن کا مذاق اڑاتا اور فارس کے بادشاہوں اور فوجی سرداروں کے مبالغہ آمیز قصے سناکر لوگوں سے کہتا کہ بتاؤ کہ محمد کا قصہ زیادہ اچھا ہے یا میرا (ایھما احسن قصصاً، انا او محمد) نضر بن حارث بدر کی جنگ میں گرفتار ہوا اور مارا گیا (تفسیر ابن کثیر، جلد ۲)

آج مکہ میں کوئی شخص یہ جملہ نہیں کہہ سکتا۔ پھر چودہ سو برس پہلے مکہ کے ایک شخص کو یہ جملہ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ اس کی وجہ زمانہ کا فرق ہے۔ چودہ سو سال پہلے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت دونوں نزاعی (Controversial) حیثیت رکھتے تھے۔ مگر آج لمبی تاریخ کے نتیجہ میں قرآن کا کتاب الٰہی ہونا اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغمبر خدا ہونا تسلیم شدہ واقعہ (Established fact) بن چکا ہے۔

یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر پہلے ایک شخص کو مذکورہ بات کہنے کی جرأت ہوتی تھی اور آج کسی کو اس قسم کے الفاظ بولنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

صحابہ کا درجہ اس لئے بڑا ہے کہ انھوں نے جوہر شناسی کی سطح پر قرآن کو اور پیغمبر کو پہچانا۔ انہوں نے اس وقت اپنے آپ کو اسلام سے وابستہ کیا جب کہ اسلام کی عظمتوں کا گنبد نہیں بنا تھا۔ آج جو لوگ پرجوش اسلامی تقریریں کرتے ہیں وہ صرف گنبد شناسی کا کمال دکھاتے ہیں۔ اگرچہ بطور خود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ حقیقت شناسی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

مانگنا

جاء رجل من الانصار الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسألہ فقال النبی اما فی بیتک شئ قال بلی، جلس (ای کساء غلیظ) نلبس بعضہ ونبسط بعضہ وقعب نشرب فیہ الماء۔ قال الرسول أئتنی بہما۔ فاتاہ بہما۔ فأخذ الرسول بیدہ وقال من یشتری ھذین۔ قال رجل انا أخذھما بدرھم قال رسول اللہ من یزید علی درھم۔ قال رجل انا أخذھما بدرھمین۔ فاعطاھما ایاہ و اخذ الدرھمین فاعطاھما الانصاری وقال اشتر باحدھما طعاماً فانبذہ الی اھلک واشتر بالآخر قدوماً وائتنی بہ۔ فاتاہ بہ فشد الرسول فیہ عودا بیدہ ثم قال اذھب فاحتطب وبع ولا اریناک خمسۃ عشر یوماً۔ ففعل وجاء وقد اصاب عشرۃ دراھم فاشتری ببعضھما ثوباً و ببعضھما طعاماً۔ فقال رسول اللہ، ھذا خیر لک من ان تجئ المسألۃ نکتۃ فی وجھک یوم القیامۃ۔

انصار میں سے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کیا تمہارے گھر میں کچھ نہیں۔ اس نے کہا ہاں، ایک موٹا کپڑا ہے جس کا کچھ حصہ ہم اوڑھتے ہیں اور کچھ حصہ بچھاتے ہیں اور ایک بڑا پیالہ ہے جس میں ہم پانی پیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ دونوں چیزیں میرے پاس لے آؤ۔ وہ لے آیا۔ آپ نے ان کو اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا کہ کون شخص ان دونوں کو خریدتا ہے۔ ایک شخص نے کہا کہ میں ان کو ایک درہم میں خریدتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ کون ایک درہم پر اضافہ کرتا ہے۔ ایک شخص نے کہا کہ میں ان کو دو درہم میں لیتا ہوں۔ آپ نے دونوں چیزیں اسے دے دیں اور اس سے دو درہم لے کر انصاری کو دے دیا اور فرمایا کہ ان میں سے ایک درہم سے کھانے کی چیز خریدو اور اسے اپنے گھر والوں کو دیدو اور دوسرے درہم سے کلہاڑی خریدو اور اس کو میرے پاس لے آؤ۔ وہ آدمی کلہاڑی لے کر آپ کے پاس آیا۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے اس میں لکڑی کا دستہ لگایا پھر فرمایا کہ جاؤ اور لکڑی کاٹو اور بیچو اور میں تم کو پندرہ دن تک نہ دیکھوں۔ آدمی نے ایسا ہی کیا۔ پھر وہ آیا اور اس نے دس درہم کمایا تھا۔ اس نے اس کے ایک حصہ سے کپڑا خریدا اور ایک حصہ سے خوراک خریدی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تمہارے لئے اس سے بہتر ہے کہ تم سوال کرو اور قیامت کے دن اپنے چہرہ پر ایک داغ لے کر آؤ۔

عن ثوبان رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تکفل لی ان لا یسئل الناس شیأ و أتکفل له بالجنة فقلت انا۔ فکان لا یسئل احداً شیأ (ابوداؤد)

حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کون ہے جو مجھے اس بات کی ضمانت دے کہ وہ لوگوں سے کوئی چیز نہ مانگے گا اور میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ میں نے کہا: میں۔ پس حضرت ثوبان کا یہ حال ہوا کہ وہ کسی سے کوئی چیز نہیں مانگتے تھے۔

اس قسم کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ "سوال" اسلامی روح کے سراسر خلاف ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی محنت پر بھروسہ کرے نہ کہ وہ دوسروں سے مانگنے لگے۔ حتی کہ گھر کا اثاثہ بیچ کر محنت کے میدان میں داخل ہونا پڑے تو یہ بھی آدمی کو کرنا چاہئے۔

سوال سے پرہیز کا حکم جو فرد کو دیا گیا ہے وہی جماعت کے لئے بھی ہے۔ مسلمانوں کی ایسی کوئی قومی پالیسی جس کی بنیاد مانگ اور مطالبہ پر رکھی جائے وہ سراسر غیر اسلامی قرار پائے گی۔ مسلمانوں کو جس طرح اپنی انفرادی زندگی میں مانگنے کے بجائے محنت کرنے پر بھروسہ کرنا ہے اسی طرح اجتماعی زندگی میں بھی انھیں یہ کرنا ہے کہ خود اپنے وسائل کی بنیاد پر اپنا قومی منصوبہ بنائیں۔ دوسروں سے مانگنے کے بجائے خود کر کے حاصل کرنے کا طریقہ اختیار کریں۔

ہر وہ قومی پالیسی باطل ہے جس کی بنیاد "مطالبات" پر رکھی گئی ہو۔ کوئی بھی عذر اس کی اجازت نہیں دیتا کہ مسلمان جد و جہد کا طریقہ چھوڑ کر مطالبات کا طریقہ اختیار کریں۔ مسلمان اگر ایسا کریں کہ وہ اپنی قومی پالیسی مطالبات کی بنیاد پر بنائیں تو یہ خدا اور رسول کے طریقہ کے سراسر خلاف ہوگا۔ مطالباتی سیاست بلاشبہہ غیر مسنون سیاست ہے۔ مسلمان چھوٹے چھوٹے معاملہ میں مسنون اور غیر مسنون کا فرق جانتے ہیں اور اس کا زبردست اہتمام کرتے ہیں۔ مگر بڑے بڑے معاملات میں انھوں نے اپنی پوری قومی سیاست کو غیر مسنون طریقہ پر چلا رکھا ہے اور انھیں اس کا احساس تک نہیں۔

مزاج دعوت

فرعون قدیم مصر کا نہایت سرکش اور متکبر بادشاہ تھا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو پیغمبر بنا کر فرعون کے پاس بھیجا۔ اس وقت اللہ نے حضرت موسیٰ اور آپ کے شریک نبوت حضرت ہارون کو جو ہدایت کی وہ یہ تھی:

اذھبا الی فرعون انہ طغیٰ۔ فقولا لہ قولاً لیناً لعلہ یتذکر او یخشیٰ (طٰہٰ ۴۴)

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ حد سے نکل گیا ہے۔ پھر اس سے تم لوگ نرمی کے ساتھ بات کرنا۔ شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔

یہ فرعون سرکشی کی آخری حد پر پہنچ گیا تھا۔ مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ وہ اصلاح قبول کرنے والا نہیں ہے۔ پھر بھی پیغمبر کو حکم ہوتا ہے کہ اس کے پاس جاؤ تو اس سے نرمی اور شفقت کے ساتھ بات کرنا۔ اس کی گمراہی اور سرکشی کی بنا پر سختی کا انداز مت اختیار کرنا۔ اس آیت کی تشریح میں مفسر ابن کثیر نے لکھا ہے:

ھذہ الایۃ فیہا عبرۃ عظیمۃ وھو ان فرعون فی غایۃ العتو والاستکبار وموسیٰ صفوۃ اللہ من خلقہ۔ اذذاک ومع ھذا امر ان لا یخاطب فرعون الا بالملاطفۃ واللین

اس آیت میں بہت بڑا سبق ہے۔ وہ یہ کہ فرعون حد درجہ سرکشی اور گھمنڈ میں مبتلا تھا اور موسیٰ انسانوں میں سے اللہ کے چنے ہوئے تھے۔ پھر بھی اور اس کے باوجود حکم ہوا کہ فرعون کو مخاطب کریں تو صرف نرمی اور ملاطفت کے ساتھ مخاطب کریں۔

اس واقعہ سے دعوت کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتی کلام کو لازمی طور پر نرم کلام ہونا چاہئے۔ مدعو کا ظلم اور سرکشی اپنی آخری حد پر پہنچ جائے، حتیٰ کہ یہ بھی واضح ہو کہ وہ ہدایت قبول کرنے والا نہیں، تب بھی داعی کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے نرم انداز کو چھوڑ دے۔ داعی کو یک طرفہ طور پر نرمی اور شفقت پر قائم رہنا ہے۔ خواہ مدعو جو انداز بھی اختیار کرے۔

داعی بننا صبر کی زمین پر کھڑا ہونا ہے۔ جو لوگ صبر کی زمین پر کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رکھتے انھیں دعوت کا نام بھی نہیں لینا چاہئے۔

دعوت کی کرامت

غزوۂ خندق ۵ھ میں پیش آیا۔ ابوسفیان کی سرداری میں دس ہزار مسلح آدمیوں نے مدینہ کو گھیرلیا۔ یہ بڑا سخت موقع تھا۔ اسی کے لئے قرآن میں آیا ہے کہ جب آنکھیں پھر گئیں اور دل گلوں تک پہنچ گئے (الاحزاب ۱۰) مدینہ میں گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ ایک مسلمان کی زبان سے نکل گیا:

کان محمد یعدنا ان ناکل کنوز کسریٰ وقیصر واحدنا الیوم لایأمن علی نفسہ ان یذھب الی الغائط (سیرۃ النبی لابن ہشام، الجزء الثالث، صفحہ ۲۳۸)

محمد ہم سے وعدہ کرتے تھے کہ ہم کسریٰ اور قیصر کے خزانے حاصل کریں گے اور حال یہ ہے کہ ہم میں سے ایک شخص بیت الخلا جانے کے لئے بھی مامون نہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جنگ اور امن ہر حال میں دشمن کی سرگرمیوں کی خبر معلوم کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب یہ عظیم فوج مکہ سے روانہ ہوئی تو مدینہ میں آپ کو اس کی خبر ہوگئی۔ آپ نے لوگوں کو مشورہ کے لئے جمع کیا۔ اور ان سے پوچھا کہ بتاؤ ایسی حالت میں اپنے بچاؤ کے لئے کیا کیا جائے۔

اس وقت حضرت سلمان فارسی نے مشورہ دیا کہ مدینہ کے کنارے خندق کھودی جائے۔ مدینہ کے ایک طرف کھجوروں کے گھنے باغات نے قدرتی دیوار قائم کر رکھی تھی۔ شمال مشرق سے شمال مغرب تک کا حصہ کھلا ہوا تھا۔ اسی حصہ میں خندق کھودی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ خندق کی لمبائی تقریباً پانچ ہزار ہاتھ تھی۔ گہرائی سات ہاتھ سے دس ہاتھ تک اور چوڑائی تقریباً دس ہاتھ۔

ابن کثیر نے طبری اور سہیلی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ پہلا شخص جس نے خندق کھودی وہ فارس کا بادشاہ منوچہر بن فریدون تھا۔ وہ حضرت موسیٰ کا ہم عصر تھا۔ حضرت سلمان فارس کے رہنے والے تھے مشورہ کے وقت انھوں نے بتایا کہ اے خدا کے رسول، اہل ایران کا یہ طریقہ ہے کہ جب گھوڑ سوار لشکر کے حملہ کا ڈر ہوتا ہے تو وہ اس کے مقابلہ کے لئے خندق کھودتے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا اور خود صحابہ کے ساتھ شریک ہوکر خندق کھودی۔

"خندق" کا لفظ اصلاً فارسی سے آیا ہے۔ اس کی اصل کندہ (کھودا ہوا) ہے۔ کندہ سے کندک اور خندک بنا جو عربی زبان میں خندق ہوگیا۔ اس وقت تک اہل عرب میں یہ طریقہ بالکل غیر معروف تھا۔ چنانچہ

مکہ والوں کے سرداروں نے جب اس کو دیکھا تو کہا:

والله ان هذه لمكيدة ما كانت العرب تكيدها — خدا کی قسم یہ ایک ایسی تدبیر ہے جس تدبیر کو عرب استعمال نہیں کرتے تھے۔

سیرۃ ابن ہشام، الجزء الثالث، صفحہ ۲۴۰)

اس واقعہ میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب بھی عرب تھے اور وہ لوگ بھی عرب تھے جنھوں نے مکہ سے آکر آپ کے اوپر چڑھائی کی تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کو ایسا شخص مل گیا جو ان کو فارسی خندق کا طریقہ بتائے۔ اور مکہ کے مشرکین کو فارسی خندق کا طریقہ بتانے والا نہیں ملا۔

اس فرق کی وجہ دعوت تھی۔ مشرکین مکہ کا معاشرہ ایک جامد معاشرہ تھا۔ اس میں باہر سے کوئی اضافہ ممکن نہ تھا۔ جب کہ مسلمانوں کا معاشرہ ایک اضافہ پذیر معاشرہ تھا جس میں ہر آن تبلیغ کے ذریعہ مزید انسانی صلاحیتیں شامل ہوتی جارہی تھیں۔ اسلام کا یہی خاص ایڈوانٹج تھا جس کی بنا پر اس کو ایک سلمان فارسی مل گیا جو اس کو فارسی طریقہ بتائے۔ اس کے برعکس مشرکین مکہ کسی سلمان فارسی کو نہ پاسکے جو ان کو عرب سے باہر کے طریقوں کی خبر دے۔

تاریخ کی کتابوں میں یہ دونوں واقعات الگ الگ لکھے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کا خندق سے باخبر ہو کر مدینہ کے گرد خندق کھودنا۔ اور مشرکین مکہ کا خندق کی تدبیر سے بے خبر رہنا۔ ان دونوں واقعات کو الگ الگ پڑھئے تو آپ کو ان سے کوئی نصیحت نہیں ملے گی۔ مگر جب ان دونوں واقعات کو مربوط کریں، جب ان کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھیں تو اچانک ایک عظیم سبق کا انکشاف ہوتا ہے۔ یہ کہ دعوت اس دنیا میں سب سے بڑی قوت ہے۔ وہ اپنی قوت پر دوسروں کی قوت کا اضافہ ہے۔

دعوت کے بغیر معاشرہ ایک جامد چٹان ہے۔ مگر دعوت کے اضافہ کے بعد معاشرہ ایک سیلاب بن جاتا ہے۔ ایسا سیلاب جو بڑھتا ہی رہے۔ ایسا سیلاب جو سارے جغرافیہ ارضی میں پھیل جائے۔

پچھلے انبیاء

عن عبد الله بن عباس رضی الله عنه قال قدم رسول الله صلی الله علیه وسلم المدینة فرأی الیهود تصوم عاشوراء۔ فقال لهم ماهذا الیوم الذی تصومونه۔ قالوا هذا یوم عظیم۔ انجی الله فیه موسی وقومه وغرق فیه عدوهم فصامه موسی شکراً فنحن نصومه فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم :

فنحن احق واولی بموسی منکم فصامه رسول الله صلی الله علیه وسلم وامر بصیامه (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ مدینہ آئے۔ آپ نے یہود کو دیکھا کہ وہ عاشورا کے دن روزہ رکھتے ہیں۔ آپ نے ان سے کہا کہ یہ کیسا دن ہے جس میں تم لوگ روزہ رکھتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک بڑا دن ہے۔ اس دن اللہ نے موسیٰ اور ان کی قوم کو نجات دی اور آپ کے دشمن (فرعون) کو پانی میں ڈبو دیا۔ اس کے بعد موسیٰ نے اس دن شکر کے طور پر روزہ رکھا۔ پس ہم بھی اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم تم سے زیادہ موسیٰ کے حق دار ہیں اور قریب ہیں چنانچہ آپ نے اس دن روزہ رکھا اور دوسرے مسلمانوں کو بھی اس دن روزہ رکھنے کے لئے کہا۔

اس سے معلوم ہوا کہ پچھلے پیغمبروں کا ثابت شدہ عمل مسلمانوں کے لئے بھی اسی طرح قابل تقلید ہے۔ جس طرح وہ ان پیغمبروں کی اپنی امتوں کے لئے قابل تقلید تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر میں مبعوث ہوئے تو وہاں دو قسم کے گروہ پائے جاتے تھے۔ ایک فرعون کی قوم جو قبطی کہی جاتی تھی۔ دوسری بنی اسرائیل کی قوم جو گویا قدیم زمانہ کے مسلمان تھے۔ یہ دونوں گروہ ہدایت سے دور تھے۔ فرعون کی قوم اگر کفر و شرک میں مبتلا تھی تو بنی اسرائیل ہر قسم کے دینی بگاڑ کا شکار تھے۔ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے۔ آپ کو بنی اسرائیل کی اصلاح کرنا تھا۔ مگر بنی اسرائیل کی اصلاح کے انتظار میں آپ نے قوم فرعون پر دعوت حق کا کام موقوف نہیں کیا۔ آپ نے بیک وقت دونوں کام شروع کئے۔ گویا یہ طریقہ غیر پیغمبرانہ طریقہ ہے کہ مسلمانوں کے بگاڑ کو عذر بنا کر غیر مسلموں میں دعوت کا کام نہ کیا جائے۔

مقصدیت

دہلی میں ایک مسلم نوجوان تھا۔ وہ غریب گھر میں پیدا ہوا۔ اس کی باقاعدہ تعلیم بھی نہ ہو سکی۔ تاہم وہ تندرست اور باصلاحیت تھا۔ جب وہ بڑا ہوا تو اس کو محسوس ہوا کہ ماحول میں اس کے لئے کوئی باعزت کام نہیں ہے۔ آخر کار وہ داداگیری کی راہ پر لگ گیا۔ جھگڑا فساد اور لوٹ مار اس کا پیشہ بن گیا۔ لوگ اس کو دادا کہنے لگے۔

چند سالوں کے بعد ایک شخص کو اس سے ہمدردی ہوئی۔ اس نے اپنے پاس سے کچھ رقم بطور قرض دے کر اس کو دکانداری کرا دی۔ جب وہ دکان میں بیٹھا اور اس کو نفع ملنے لگا تو اس کی تمام دلچسپیاں دکان کی طرف مائل ہوگئیں۔ اس نے داداگیری چھوڑ دی اور پوری طرح دکان کے کام میں مصروف ہوگیا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا معاملہ بھی ایسا ہی کچھ ہو رہا ہے۔ انھوں نے مقصدیت کھو دی ہے۔ جدید دنیا میں وہ ایک بے مقصد گروہ بن کر رہ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس آج منفی باتوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ شکایت اور احتجاج کا مجسمہ بن گئے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ان کی ہر نشست مجلس شکایت ہوتی ہے اور ان کا ہر جلسہ یوم احتجاج۔

اس صورت حال کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایک بامقصد گروہ بنایا جائے۔ اور یہ مقصد صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ دعوت ہے۔ مسلمانوں کے اندر اگر داعیانہ مقصد پیدا کر دیا جائے تو ان کی تمام کمزوریاں اپنے آپ دور ہو جائیں گی۔

وہ اپنے کرنے کا ایک اعلیٰ اور مثبت کام پالیں گے۔ ان کی بے مقصدیت اپنے آپ مقصدیت میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس کے بعد ان کے اندر کردار بھی آئے گا اور صبر و برداشت بھی۔ وہ دوسروں سے نفرت کرنے کے بجائے محبت کرنے لگیں گے۔ اس کے بعد ان کو وہ نظر حاصل ہو جائے گی جو تاریکی میں روشنی کا پہلو دیکھ لیتی ہے۔ جو کھونے میں پانے کا راز دریافت کر لیتی ہے۔

مقصدیت ہر قسم کی اصلاح کی جڑ ہے۔ بے مقصد آدمی کا دماغ شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔ آدمی کو بامقصد بنا دیجئے اور اس کے بعد اپنے آپ اس کی ہر چیز درست ہو جائے گی۔

متحدہ عمل

اسٹیم انجن چلانے والا آدمی آگ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ مادی مجموعہ متحرک ہو جس کو مشین کہتے ہیں۔ اسی طرح مل کر کام کرنے والوں کو برداشت کی زمین پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ جو لوگ برداشت کے لئے تیار نہ ہوں وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام بھی نہیں کر سکتے۔

جب بھی کچھ لوگ باہم مل کر کام کریں تو لازماً ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ ایک کے دل میں دوسرے کے خلاف شکایت کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ ایسا بہر حال ہوتا ہے۔ جمع ہونے والے لوگ انفرادی طور پر خواہ کتنے ہی اچھے ہوں مگر ایک دوسرے کے خلاف اس قسم کے منفی جذبات لازماً پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی پیدائش کو کسی حال میں روکا نہیں جا سکتا۔

ایسی حالت میں متحدہ کوشش اور مشترکہ عمل کو کیسے ممکن بنایا جائے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ ہے اختلاف کے باوجود متحد رہنا۔ لوگوں کو شعوری طور پر اتنا بیدار ہونا چاہئے کہ وہ ہر شکایت کو پی جائیں۔ ہر جذباتی ردعمل کو اپنے سینہ میں دفن کر دیں۔ وہ اتحاد کو باقی رکھنے کی خاطر ہر اختلافی بات کو برداشت کرتے رہیں۔

یہ مطالبہ کسی ناممکن چیز کا مطالبہ نہیں ہے۔ یہ عین وہی چیز ہے جس کو ہر آدمی عملاً اپنے گھر میں اختیار کئے ہوئے ہے۔ ایک گھر جس کے اندر چند افراد خاندان مل کر رہتے ہوں ان میں روزانہ کسی نہ کسی بات پر ناگواری پیش آتی ہے۔ روزانہ ایک کے دل میں دوسرے کے خلاف شکایتی جذبات ابھرتے ہیں۔ مگر پھر خونی رشتہ غالب آتا ہے۔ بار بار ناگواری پیدا ہوتی ہے اور بار بار باہمی محبت کا جذبہ اسے ختم کرتا رہتا ہے۔ اس طرح گھر کا اتحاد برقرار رہتا ہے۔ ہر گھر اختلاف کے باوجود متحد رہنے کی عملی مثال ہے۔

یہی چیز اجتماعی زندگی میں شعور کے تحت ظہور میں آتی ہے۔ خاندانی زندگی میں جو واقعہ محبت کے جذبہ کے تحت پیش آتا ہے وہی واقعہ اجتماعی زندگی میں شعوری فیصلہ کے تحت انجام دیا جاتا ہے۔ گھر کے اندر دل کا تعلق لوگوں کو باہم جڑے رہنے پر مجبور کرتا ہے اور گھر کے باہر لوگوں کا عقلی فیصلہ انھیں اس بات کا پابند بناتا ہے کہ وہ اتحاد کو باقی رکھنے کی خاطر ہر ناگواری کو گوارا کرتے رہیں۔

انانیت

حافظ ابو خیثمہ زہیر بن حرب النسائی (۲۳۴ - ۱۶۰ھ) کہتے ہیں کہ مجھ سے محمد بن خازم نے کہا۔ ان سے اعمش نے کہا اور ان سے شقیق نے۔ وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عبداللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: خدا کی قسم جو شخص لوگوں کے ہر سوال پر فتویٰ دے وہ پاگل ہے (واللہ إن الذی یفتی الناس فی کل ما یسألونہ لمجنون، کتاب العلم صفحہ ۸)

اس قول کی زد ان لوگوں پر پڑتی ہے جن کا حال یہ ہو کہ ان سے جو بھی سوال کیا جائے وہ اس پر فوراً ایک شرعی فتویٰ دے دیں۔ ایسے لوگ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ کے اندر انانیت تھی۔ وہ اپنے سوا کسی کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قول کے اندر جو زور بیان ہے وہ بات کا ہے نہ کہ ذات کا۔ حضرت عبداللہ کا مقصود اس انداز کلام سے یہ تھا کہ حق کا حق ہونا بتائیں نہ کہ خود اپنا برسرِ حق ہونا۔

ایک ہے حق کو حق سمجھنا۔ دوسرا ہے اپنے آپ کو حق سمجھنا۔ حضرت عبداللہ کا جملہ پہلی چیز کی مثال ہے نہ کہ دوسری چیز کی مثال۔ مگر جو نادان ہیں۔ جو باتوں کی نزاکت کو نہیں سمجھتے وہ اس کو دیکھ کر کہہ دیں گے کہ "عبداللہ" کو اپنے علم کا گھمنڈ ہو گیا تھا اس لئے انھوں نے دوسروں کو پاگل قرار دے دیا۔

اصل یہ ہے کہ جب ایک آدمی اپنے آپ کو صد فی صد حق کے ساتھ وابستہ کر دے۔ وہ حق کے نفع اور نقصان کو اپنا نفع اور نقصان سمجھنے لگے تو اس کی اپنی ذات اس کی نظر میں حذف ہو جاتی ہے۔ وہ بعض اوقات انتہائی شدید الفاظ بولتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس کی یہ شدت تمام تر حق کے لئے ہوتی ہے نہ کہ اپنی ذات کے لئے۔ وہ حق کی صداقت کا اعلان کرنے والا ہوتا ہے نہ کہ اپنی ذات کا اعلان کرنے والا۔

مگر جو لوگ صرف ظاہر کو جانتے ہیں وہ اظہار حق کے کلام کو اظہار خویش کا کلام سمجھ لیتے ہیں۔ وہ سیدھی بات کو الٹا مفہوم پہنا دیتے ہیں۔ بیان کرنے والا خدا کی یکتائی بیان کرتا ہے اور لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ خود اپنی یکتائی بیان کر رہا ہے۔ بولنے والا حق کی عظمت کا اعلان کر رہا ہوتا ہے اور لوگ یہ گمان کر لیتے ہیں کہ وہ خود اپنی عظمت کا اعلان کر رہا ہے۔

شاعری

مولانا بدرالدین چاچی ایک فارسی شاعر گزرے ہیں۔ ان کے قصائد کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

آنچہ بر من رفت گر بر اشتراں رفتے زغم می زدندے کافراں بر جنت الماویٰ علم

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ کافر جنت میں داخل نہ ہوں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں نہ چلا جائے (الاعراف ۴۰) مذکورہ شعر اسی آیت کے اوپر لکھا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جو بے پناہ صدمات اور غم مجھے اٹھانے پڑے ہیں وہ صدمات اور غم اگر اونٹوں کو پیش آتے تو اونٹ جیسا بڑا جانور گھل گھل کر اتنا دبلا ہو جاتا کہ وہ سوئی کے ناکے میں داخل ہو کر اس سے نکل جاتا۔

پھر جب یہ واقعہ ہوتا کہ اونٹ سوئی کے ناکے کے اندر چلا جائے تو وہ رکاوٹ باقی نہ رہتی جو آیت میں مذکور ہے۔ اس کے بعد تو کافر بھی جنت میں پہنچ کر اپنا جھنڈا گاڑ دیتے۔ اونٹ کے سوئی کے ناکے سے پار ہونے کے بعد یہ تعلیق خود بخود اٹھ جاتی اور محال ممکن ہو جاتا۔

فارسی شاعری اور اس کے اثر سے اردو شاعری زیادہ تر اسی قسم کے مضامین سے بھری ہوئی ہے۔ دور از کار مبالغوں اور فرضی تک بندیوں کا دوسرا نام فارسی اور اردو شاعری ہے۔ اسی شاعری کے بطن سے وہ نثر نکلی جس کو خطیبانہ نثر کہا جا سکتا ہے۔

بعد کے دور میں اسی قسم کے شاعر ادیب و خطیب قوم کے لیڈر بن گئے۔ انھوں نے پوری قوم کے مزاج کو ویسا ہی بنا دیا جس کا ایک نمونہ اوپر کے شعر میں نظر آتا ہے۔

اب لوگ لفظی تک بندیوں سے معنوی نتائج کی امید کرنے لگے۔ تشبیہہ اور ترکیب سے ثابت ہو جانے کو یہ اہمیت دینے لگے گویا کہ فی الواقع بھی وہ بات ثابت ہو گئی ہے۔ جوش کلام کو جوش عمل کا ہم معنی سمجھ لیا گیا۔ الفاظ کے زور پر حقائق کے قلعے فتح ہونے لگے۔ ردیف و قافیہ کے زور پر اونٹ کو سوئی کے ناکہ سے پار کر دیا گیا۔ مگر جب ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ ابھی تک وہ سوئی کے ناکہ کے باہر کھڑا ہوا ہے۔

جدید نسل

ٹائمس آف انڈیا (۲۱ مئی ۱۹۸۵) میں مسٹر جارج منٹر یز نے اپنا قصہ شائع کیا ہے۔ انھیں ایک کالج کے سمر کیمپ کا افتتاح کرنا تھا۔ مسٹر جی بی کھیر جب بمبئی کے وزیر تعلیم تھے تو ان کے والد اس وقت وزارت تعلیم میں انڈر سکرٹری تھے۔ میٹرک کا رزلٹ آیا تو مضمون نگار کے بھائی ریاضی میں چند نمبروں سے فیل ہو گئے۔ ایک ماسٹر صاحب ازراہ خیر خواہی طالب علم کے والد (انڈر سکرٹری وزارت تعلیم) سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ماڈریٹر (Moderator) کو ایک ٹیلیفون کر دیں اور سب معاملہ درست ہو جائے گا۔ مضمون نگار کا بیان ہے کہ ان کے والد نے اس کے جواب میں کہا کہ میرا لڑکا اگر فیل ہونے کا مستحق ہے تو اس کو فیل ہونے دیجئے۔ یہ واقعہ اس کو ایک اچھا سبق دے گا:

If my son deserves to fail, let him fail.
It will teach him a valuable lesson.

مضمون نگار کہتے ہیں کہ مذکورہ سمر کیمپ کا افتتاح کرتے ہوئے میں نے یہ واقعہ بیان کیا تو طلبہ نے اس کو اس طرح سنا جیسے وہ بالکل غیر اہم بات ہو۔ حتی کہ ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر کہا کہ آپ کے والد کوئی بے وقوف آدمی ہوں گے۔ اگر وہ میرے ساتھ ایسا کرتے تو میں ان کو مار ڈالتا:

Your father must have been a fool. I would
have killed him if he had done that to me.

آجکل کے نوجوانوں میں یہ مزاج عام ہے۔ ہندستان میں بھی اور اسی طرح پاکستان میں بھی۔ اس مزاج کو پیدا کرنے کی اصل ذمہ داری لیڈروں پر ہے۔ لیڈروں نے اپنی مخالف حکومتوں کا تختہ الٹنے کے لئے نوجوانوں کو بھڑکایا۔ وہ ان کی تخریبی کارروائیوں کو صحیح بتاتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماضی کی تمام روایات ٹوٹ گئیں۔ آدمی کے سامنے اس کی خواہشات اور مفادات کے سوا کوئی چیز نہیں رہی جس کا وہ لحاظ کرے۔

احترام کی روایات کو توڑنے کا مزاج اگر ایک بار پیدا ہو جائے تو وہ کسی حد پر نہیں رکتا۔ غیروں کو بے عزت کرنے والے بالآخر اپنوں کو بھی بے عزت کر کے رہتے ہیں۔

تفریق کا سبب

اختلافات ہمیشہ چھوٹے مسائل میں ہوتے ہیں نہ کہ بڑے بڑے مسائل میں۔ مثلاً "محمد بن عبد اللہ پیغمبر تھے" اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ عقیدہ تمام مسلمانوں کا مشترکہ عقیدہ ہے۔ مگر آپ پر درود کیسے بھیجا جائے، اس میں جزئی اختلافات پیدا ہو گئے۔ مثلاً سنی حضرات آپ کے نام کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ لکھتے اور بولتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں شیعہ حضرات کا طریقہ یہ ہے کہ وہ آپ کے نام کے آگے صلی اللہ علیہ وآلہ کا لفظ شامل کرتے ہیں۔

اسی طرح مثلاً تمام مسلمان اس کو مانتے ہیں کہ ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان سے ملے تو وہ سلام اور مصافحہ کرے۔ مگر یہاں یہ اختلاف ہے کہ حنفی لوگ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرتے ہیں اور اہل حدیث حضرات ایک ہاتھ سے مصافحہ کرتے ہیں۔

شریعت میں اس طرح کے اختلافات کا پیدا ہونا بذات خود نہ غلط ہے اور نہ مضر بلکہ اس طرح کے اختلافات ایک طبیعی امر ہیں اور ہر گروہ میں اور ہر زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر اصل غلطی یہ ہے کہ لوگ موشگافیاں کر کے یہ ثابت کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ ان کا طریقہ افضل ہے اور دوسرے کا طریقہ غیر افضل ان کا طریقہ راجح ہے اور دوسرے کا طریقہ مرجوح۔ بس یہیں سے خرابی شروع ہو جاتی ہے۔ لوگ غیر ضروری بحثیں کرنے لگتے ہیں اور انھیں چھوٹی چھوٹی باتوں کی بنیاد پر ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔

اس طرح کے معاملات میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ـــــ یہ بھی درست ہے اور وہ بھی درست ہے۔ آدمی جس طریقہ کو چاہے اختیار کرے اور اسی کے ساتھ دوسرے کو دوسرے طریقہ پر چلنے دے۔

اس طرح کے ضمنی امور میں راجح اور مرجوح، افضل اور غیر افضل کی بحث چھیڑنا سخت مضر ہے۔ ایسی بحث ہمیشہ اس قیمت پر ہوتی ہے کہ بنیادی چیزوں سے نظریں ہٹ جائیں اور غیر بنیادی چیزیں لوگوں کی توجہات کا مرکز بن جائیں اور نتیجہ میں امت مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر رہ جائے۔

اساسی اور بنیادی چیزوں میں زور دینے کا لازمی نتیجہ اتحاد ہے اور جزئی اور ضمنی چیزوں میں زور دینے کا لازمی نتیجہ اختلاف۔

بے معنی بحثیں

امام غزالی (۵۰۵ - ۴۵۰ھ) مشہور ترین حکماء اسلام میں سے ہیں۔ وہ معلم اور متکلم بھی تھے اور اسی کے ساتھ صوفی بھی۔ ان کی کتابوں میں احیاء علوم الدین ایک معرکتہ الآراء کتاب سمجھی جاتی ہے۔

امام غزالی نے عربی ترجموں کی مدد سے یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد اپنی کتاب تہافت الفلاسفہ لکھی۔ انھوں نے فلسفہ ارسطو حسب تشریح ابن سینا سے ۲۰ مسئلے منتخب کئے۔ ان میں سے تین مسئلے ان کے نزدیک ایسے تھے جو کفر بواح کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی بنا پر انھوں نے بعض مسلم فلسفیوں کی تکفیر کی۔

۱۰۵۶ھ کا واقعہ ہے۔ شاہ جہاں نے ہندستان سے اپنا ایک سفیر شاہ ایران کی خدمت میں روانہ کیا۔ ان کا نام جاں نثار خان تھا۔ ان کے ساتھ محمد فاروق اور محب علی نامی دو اشخاص اور تھے یہ دونوں معقولات کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔

اس وقت ایران کا جو وزیر تھا وہ بھی معقولات کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس کی نسبت سعد اللہ خاں علامی نے لکھا ہے کہ اعلم العلماء آں دیار است۔ یعنی وہ اس علاقہ کا سب سے بڑا عالم ہے۔ محمد فاروق اور محب علی کو اپنے فضل و کمال کا بہت دعویٰ تھا۔ چنانچہ وہ شاہ ایران کے دربار میں بلائے گئے اور ایرانی وزیر سے ان کا مناظرہ ہوا۔ وزیر نے پوچھا کہ امام غزالی نے مسائل ثلاثہ (قدم عالم اور نفی علم باری بجزئیات مادیہ اور انکار حشر اجساد) کی بنا پر ابو نصر فارابی اور شیخ بوعلی سینا کو کافر قرار دیا ہے۔ اور دوسرے گروہ نے ان حکماء کے کلام کی توجیہہ و تاویل کی ہے۔ آپ لوگ اس بارہ میں کیا کہتے ہیں۔ مذکورہ دونوں اشخاص اس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ سعد اللہ خاں علامی کے الفاظ ہیں:

مدعیان دروغ چوں شمع کشتہ بے فروغ ماندند

یعنی علم کے جھوٹے دعویدار بجھے ہوئے چراغ کی طرح بے فروغ ہو کر رہ گئے (الدرۃ الثمینہ)

شاہجہاں کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب کہ دنیا ایک دور سے نکل کر دوسرے دور میں داخل ہونے جا رہی تھی۔ مگر عین اسی زمانہ میں مسلمان لایعنی بحثوں میں مبتلا تھے۔ وہ ایسے معاملات کو جیت اور ہار کا معاملہ سمجھتے تھے جن کا جیت اور ہار سے کوئی تعلق نہیں۔

ناقص استدلال

منشی امیر اللہ تسلیم اودھ کے نواب واجد علی شاہ کے ہمعصر تھے۔ ان کا شمار دربار کے شاعروں میں ہوتا تھا۔ اودھ کی مسلم سلطنت ختم ہونے کے بعد وہ رام پور چلے گئے۔ اور اس زمانہ کے شعر پسند حلقے میں کافی مقبول ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک عیسائی نے ایک بار ان کو ایک مصرعہ دیا اور کہا کہ آپ اس پر دوسرا مصرعہ لگائیے۔ عیسائی کا مصرعہ یہ تھا:

دین احمد کا گھٹے دین مسیحا بڑھ جائے

منشی امیر اللہ تسلیم نے برجستہ دوسرا مصرعہ لگا کر عیسائی کو لاجواب کر دیا۔ منشی امیر اللہ تسلیم کا مصرعہ یہ تھا:

گر براق نبوی سے خر عیسیٰ بڑھ جائے

یہ ایک دلچسپ مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم دانشور کس طرح تجزیاتی استدلال کے طریقہ سے بے خبر رہے۔ منشی امیر اللہ تسلیم کا یہ تقابل صحیح نہیں۔ ان کی غلطی یہ ہے کہ وہ رسول اللہ کے آسمانی سفر کا تقابل حضرت مسیح کے زمینی سفر سے کر رہے ہیں۔ حالانکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آسمانی سفر کا تقابل آسمانی سفر سے اور زمینی سفر کا تقابل زمینی سفر سے کیا جائے۔

پیغمبر اسلام نے معراج کے وقت براق کے ذریعہ آسمانی سفر کیا تھا۔ اسی طرح یہ ثابت ہے کہ حضرت مسیح کا آسمان کی طرف زندہ رفع ہوا۔ یہ "رفع" یقیناً کسی غیر معمولی "سواری" کے ذریعہ ہوا۔ دوسری طرف سیرت کی کتابیں بتاتی ہیں کہ جس طرح حضرت مسیح گدھے پر بیٹھے اسی طرح پیغمبر اسلام نے بھی گدھے پر سفر فرمایا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ آسمانی سفر میں دونوں پیغمبروں کی سواری براق تھی اور زمینی سفر میں دونوں پیغمبروں نے گدھے کی سواری استعمال فرمائی۔

صحیح استدلال وہی ہے جو منطقی تجزیہ میں پورا اترے۔ بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے مسلمان تجزیاتی استدلال سے اتنے بے خبر ہیں کہ ان کے انتہائی بڑے بڑے مصنفین اور مفکرین کے یہاں بھی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

ہندستان میں برطانی حکومت کے دور میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں مناظرے ہوا کرتے تھے۔

ان مناظروں کا مقصد دعوت نہیں تھا۔ بلکہ صرف یہ تھا کہ ایک دوسرے کے مذہب کو نیچا دکھایا جائے۔ مسلمانوں کو مسیحی اقوام سے سیاسی شکایت پیدا ہوگئی۔ اسی سیاسی شکایت کے مذہبی اظہار کا دوسرا نام مناظرہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان مناظروں میں نہ ایک فریق سنجیدہ گفتگو کرتا تھا اور نہ دوسرا فریق۔

کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں آگرہ میں ایک پادری صاحب تھے۔ انھوں نے آگرہ کے چوک پر ایک بار تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ــــــ "جو شخص آسمان پر ہے اس کا مرتبہ اونچا ہے یا جو شخص زمین پر ہے اس کا مرتبہ اونچا ہے"۔ حضرت مسیح کے ساتھ "رفع" کا معاملہ ہوا تھا۔ یعنی سولی کے وقت وہ آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ دوسری طرف پیغمبر اسلام وفات پاکر قبر میں دفن کئے گئے۔ اس فرق سے تمثیلی استدلال کرتے ہوئے پادری صاحب نے حضرت مسیح کو اونچا ظاہر کیا اور پیغمبر اسلام کو نیچا۔

اس کے جواب میں ایک مسلمان دوکاندار نے دوسری تمثیل پیش کی۔ اس نے اپنا ترازو اٹھایا اور کہا کہ پادری صاحب، اس ترازو کو دیکھئے۔ آپ بتائیے کہ ترازو کا جو پلہ نیچے جھکا ہوا ہے اس کا وزن زیادہ ہے یا جو پلہ اوپر کی طرف اٹھا ہوا ہے اس کا وزن زیادہ ہے۔ کہانی بتاتی ہے کہ پادری صاحب کو اقرار کرنا پڑا کہ جو پلہ نیچے کی طرف جھکا ہوا ہے اس کا وزن زیادہ ہے ــــــ ایک تمثیل میں پادری صاحب نے اپنے موافق دلیل پالی اور دوسری تمثیل میں مسلم دکاندار نے۔

مگر اس قسم کا تمثیلی استدلال نہایت کمزور طریق استدلال ہے۔ تمثیل کے ذریعہ کوئی چیز ثابت ہو تب بھی علمی طور پر وہ ثابت نہیں ہوتی۔ اور اگر وہ رد ہو تب بھی وہ علمی طور پر رد نہیں ہوتی۔ تمثیل ایک ایسا ربر ہے جس کو ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق گھٹا یا بڑھا سکتا ہے۔ تمثیل کسی بات کو سمجھانے کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے۔ مگر اس سے نہ کوئی چیز ثابت ہوتی اور اس سے نہ کوئی چیز رد ہوتی۔

ایک زمانہ تھا کہ اس ملک میں مسلم اور غیر مسلم دونوں برابر کی سطح پر ملتے جلتے تھے۔ اردو زبان ملک کی عام زبان تھی اس لئے دونوں کے درمیان آزادانہ بات چیت ہوتی تھی۔ یہ بہترین وقت تھا کہ خدا کے دین کی دعوت خدا کے بندوں تک پہنچائی جاتی۔ مگر مسلمانوں نے اس قیمتی وقت کو جھوٹی بحثوں میں کھو دیا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا کہ مسلمان اب یہاں ایک الگ تھلگ جماعت بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کے اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی دوری بھی پیدا ہوگئی ہے اور زبان کی دوری بھی۔

معیاری دنیا

انسان پیدائشی طور پر معیار پسند (Idealist) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ آئیڈیل دنیا کی تلاش میں رہتا ہے۔ قدیم زمانہ سے لے کر آج تک تمام انسان اسی کھوج میں مبتلا رہے ہیں، کوئی ذہنی اور فکری طور پر اور کوئی عملی اور واقعاتی طور پر۔

موجودہ زمانہ کے اسلامی مفکرین نے جب دیکھا کہ انسان آئیڈیل زندگی کی تلاش میں ہے تو انھوں نے اسلام کو آئیڈیل نظام کے روپ میں پیش کرنا شروع کر دیا۔

مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں آئیڈیل نظام بن نہیں سکتا۔ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں اگر نیک لوگوں کو آزادی ہے تو یہاں برے لوگوں کی رسی بھی دراز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر کامل کے لائے ہوئے انقلاب کے فوراً بعد عرب میں ارتداد کا فتنہ پھوٹ پڑا۔ حضرت عمر فاروق جیسے عادل حکمراں کو بھی قتل کرنے والے پیدا ہو گئے۔ وغیرہ۔ انسان کو دراصل ہمیں یہ بتانا تھا کہ جس معیاری زندگی کی تمھیں تلاش ہے وہ تم کو کل آخرت میں مل سکتی ہے۔ اس کے برعکس مسلم مفکروں نے یہ کیا کہ اسی آج کی دنیا میں لوگوں کو آئیڈیل زندگی کا نقشہ تقسیم کرنے لگے۔

انسان کے اندر معیاری دنیا کی تلاش اس لئے رکھی گئی ہے کہ وہ موجودہ غیر معیاری دنیا پر قانع نہ ہو۔ وہ اپنی خوابوں کی دنیا کو اس سے آگے کی دنیا میں حاصل کرنا چاہے۔ یہ دعوتِ آخرت کی طرف سے ایک نفسیاتی محرک ہے۔ انسان کے اندر معیار پسندی کا جذبہ اس لئے تھا کہ اس کو استعمال کر کے ہم دعوت آخرت کو اس کے لئے قابل قبول بنائیں۔ مگر مسلم مفکرین نے یہ نادانی کی کہ آدمی کو ایک لفظی کھلونا دے کر دوبارہ اسی آج کی دنیا میں اسے مشغول کر دیا۔ ایک ایسا دین جو آخرت کی طرف پکارنے والا تھا۔ اس کو دنیا کی پکار بنا کر رکھ دیا۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— اللھم لاعیش الا عیش الاخرۃ (خدایا، زندگی نہیں ہے مگر آخرت کی زندگی) مطلب یہ ہے کہ اپنی پسند کی زندگی جو آدمی بنانا چاہتا ہے وہ موجودہ دنیا میں نہیں بنتی۔ وہ تو صرف آخرت میں بنے گی۔ موجودہ دنیا معیار کے احساس کے لئے ہے نہ کہ معیار کے حصول کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی کو خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ نہ غریب کو اور نہ امیر کو۔ نہ عام آدمی کو اور نہ کسی بادشاہ کو۔

عملی حل

ایک عالم نفسیات کا قول ہے کہ جب کسی کی انا کو مَس کیا جاتا ہے تو وہ برتر انا بن جاتا ہے اور اس کا نتیجہ ہے فساد:

When one's ego is touched, it turns into super-ego, and the result is break-down.

عمیر بن حبیب بن حماشہ رضی اللہ عنہ نے اپنے آخر زمانہ میں اپنے پوتے ابوجعفر الخطمی کو ایک لمبی نصیحت کی۔ اس نصیحت کا ایک حصہ صبر سے متعلق تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا:

من لا یرضی بالقلیل مما یاتی به السفیه یرضی بالکثیر (الطبرانی فی الاوسط)

جو شخص نادان کے چھوٹے شر پر راضی نہ ہوگا اس کو نادان کے بڑے شر پر راضی ہونا پڑے گا۔

ان دونوں اقوال میں بدلے ہوئے الفاظ کے ساتھ ایک ہی بات کہی گئی ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ دنیا میں لوگوں کے شر سے بچنے کی ایک ہی یقینی تدبیر ہے۔ اور یہ کہ اپنے آپ کو لوگوں کو شر سے دور رکھا جائے۔

ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر ایک "انا" موجود ہے۔ یہ انا عام حالت میں سویا ہوا رہتا ہے اس کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی صورت صرف یہ ہے کہ اس کو سویا رہنے دیا جائے۔ اگر کسی کارروائی سے اس انا کو چھیڑ دیا گیا تو وہ سانپ کی طرح اٹھ کر کھڑا ہو جائے گا اور پھر وہ ہر وہ ممکن فساد برپا کرے گا جو اس کے بس میں ہو۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی نادان یا کسی فسادی آدمی سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ اکثر حالات میں اس کا بہترین حل یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی تکلیف کو برداشت کر لیا جائے۔ کیونکہ اگر ابتدائی معمولی تکلیف کو برداشت نہیں کیا گیا اور اس کا جواب دینے کی کوشش کی گئی تو فریق ثانی اور زیادہ بھڑک اٹھے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جس آدمی نے کنکری کی چوٹ برداشت نہیں کی تھی وہ مجبور کر دیا جائے گا کہ پتھروں کی بارش کو برداشت کرے۔

ابتدائی تیاری

ٹکسٹائل انڈسٹری میں ایک اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جس کو پیشگی عمل (Pretreatment) کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائی کپڑے کو ضروری کارروائیوں سے اس قابل بنانا کہ وہ اگلے مرحلہ کے عمل کو قبول کر سکے۔

کپڑے کو اگر رنگنا ہے تو ضروری ہے کہ پہلے اس کی صفائی کی جائے۔ اس کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ رنگ کو پوری طرح پکڑ سکے۔ اگر وہ بخوبی طور پر صاف نہ ہو یا رنگ کو جذب کرنے کی صلاحیت اس کے اندر پیدا نہ کی گئی ہو تو رنگ اس پر اچھی طرح ظاہر نہیں ہو سکتا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ رنگے ہوئے کپڑوں کے ۷۰ فی صد نقائص صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ ان پر پیشگی عمل ٹھیک طور پر نہیں کیا گیا تھا۔

پیشگی تیاری کا یہ اصول انسانی معاملات کے لئے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ کپڑے کے معاملہ کے لئے۔ اگر ہم اپنے اقدام کا اچھا نتیجہ دیکھنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اقدام سے پہلے متعلقہ تیاریاں بھی ضرور مکمل کر لیں۔ ابتدائی ضروری تیاریوں کے بغیر جو اقدام کیا جائے گا اس کا انجام اس کپڑے کا سا ہوگا جو پری ٹریٹمنٹ کے بغیر رنگائی کے مرحلہ میں داخل کر دیا جائے، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ برا۔

اگر آپ اعلیٰ صافت وجود میں لانا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ آپ کے پاس انڈسٹری ہو۔ کیونکہ انڈسٹری ہی اخبارات کو خوراک فراہم کرتی ہے۔ جس قوم کے پاس انڈسٹری نہیں، اس کے پاس صحافت بھی نہیں۔

اگر آپ الکشن کے موقع پر اپنے ووٹوں کی طاقت استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس سے پہلے آپ کے اندر اتحاد پیدا ہو چکا ہو۔ اگر آپ کی صفوں میں اتحاد نہیں ہے تو آپ کے ووٹ منتشر ہو جائیں گے وہ کوئی سیاسی طاقت نہ بن سکیں گے۔

اگر آپ کوئی اجتماعی اقدام کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ آپ کے اندر اجتماعی قیادت ہو، یعنی ایک ایسا سردار جس کی بات سب لوگ مانتے ہوں۔ اجتماعی قیادت پیدا کئے بغیر اجتماعی اقدام کرنا صرف ناکامی کے گڑھے میں چھلانگ لگانا ہے۔

اتحاد

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں توحید کی دعوت شروع کی تو وہاں کے مشرکین آپ کے سخت مخالف ہوگئے۔ وہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ہر طرح ستانے لگے۔ اس وقت آپ نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا کہ لڑکر شہید ہو جائیں۔ نبوت کے تیرھویں سال آپ مکہ چھوڑ کر دور کے شہر مدینہ چلے گئے۔

تاہم مشرکین قریش اب بھی ٹھنڈے نہیں ہوئے۔ اب انھوں نے باقاعدہ آپ کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ جنگ پر جنگ ہوتی رہی۔ مگر اسلام عرب میں فیصلہ کن طاقت نہ بن سکا۔ آخر کار آپ نے صلح کا فیصلہ کیا۔ آپ نے قریش کے ہر مطالبہ کو مان کر ہجرت کے چھٹے سال ان سے صلح کر لی۔ یہ صلح حدیبیہ تھی۔ صلح حدیبیہ حقیقۃً دس سال کا ناجنگ معاہدہ (No-war Pact) تھا جو دشمن کے مطالبات کو یک طرفہ طور پر مان کر حاصل کیا گیا۔

صلح حدیبیہ ذی قعدہ ۶ھ میں ہوئی۔ اور واقدی کے بیان کے مطابق اگلے ہی مہینہ ذی الحجہ ۶ھ میں آپ نے اطراف عرب اور اطراف مدینہ میں دعوتی وفود بھیجنے شروع کر دئے۔ ابن کثیر نے اس سلسلہ میں حسب ذیل روایت نقل کی ہے:

قال عبد اللہ بن وھب، عن یونس عن الزھری حدثنی عبد الرحمٰن بن القاری ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قام ذات یوم علی المنبر خطیباً فحمد اللہ واثنی علیہ وتشھد ثم قال اما بعد فانی ارید ان ابعث بعضکم الی ملوك الاعاجم فلا تختلفوا علیّ کما اختلفت بنو اسرائیل علیٰ عیسیٰ بن مریم۔ فقال المھاجرون یا رسول اللہ انا لا نختلف علیك فی شیٔ ابدا فمرنا وابعثنا

(ابن کثیر، السیرۃ النبویہ، المجلد الثالث، صفحہ ۵۰-۷)

(صلح حدیبیہ کے بعد) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک دن منبر پر خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے۔ آپ نے اللہ کی حمد کی اور اس کی تعریف بیان کی اور شہادت دی۔ پھر فرمایا کہ اے لوگو، میں چاہتا ہوں کہ تم میں سے کچھ لوگوں کو عجمی بادشاہوں کے پاس بھیجوں۔ پس تم لوگ میرے اوپر اختلاف نہ کرو جس طرح بنی اسرائیل نے عیسیٰ بن مریم سے اختلاف کیا۔ مہاجرین نے کہا اے اللہ کے رسول، ہم آپ سے کسی بھی چیز میں کبھی اختلاف نہ کریں گے۔ پس آپ ہم کو حکم دیجئے اور ہم کو بھیجئے۔

صلح حدیبیہ کے بعد جن امیروں اور بادشاہوں کو آپ نے دعوتی خطوط بھیجے ان کی تعداد

مختلف کتابوں کے استقصار سے ایک درجن سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کچھ مشہور مکاتیب کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱	عبداللہ بن حذافہ کو	کسریٰ کے نام	ایران
۲	سلیط بن عمرو	ہوذہ بن علی	یمامہ
۳	العلاء بن الحضرمی	منذر بن ساوی	ہجر
۴	عمرو بن العاص	جیفر و عبّاد	عمان
۵	دحیہ کلبی	قیصر روم	شام
۶	شجاع بن وہب اسدی	منذر بن الحارث	غسان
۷	عمرو بن امیہ الضمری	نجاشی	حبشہ
۸	المہاجر بن ابی امیہ	الحارث بن عبد کُلال	یمن
۹	جریر بن عبداللہ البجلی	ذوالکلاع الحمیری	اطراف یمن
۱۰	حاتب بن ابی بلتعہ	المقوقس	مصر

صلح حدیبیہ کا یہ عظیم الشان فائدہ تھا کہ اس نے اسلام کو جنگ کے محدود میدان سے نکال کر دعوت کے وسیع تر میدان میں پہنچا دیا۔ جنگ کے اعتبار سے اسلام قبائلی سرداروں کے مقابلہ میں بھی فیصلہ کن نہیں بن رہا تھا مگر دعوت کے میدان میں آتے ہی اسلام کی عظمت کا یہ حال ہوا کہ وہ شاہان عالم کے مقابلہ میں بھی اقدام کی پوزیشن میں تھا۔

مگر اسلام کو اس تسخیری میدان میں لانے کی دو لازمی شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ داعی اور مدعو کے درمیان تمام مادی اور سیاسی جھگڑوں کو یک طرفہ قربانی کے ذریعہ ختم کر دیا جائے۔ تاکہ سننے اور سنانے کی معتدل فضا پیدا ہو۔ دوسری لازمی شرط داعی گروہ کا آپس کا اتحاد ہے تاکہ وہ طاقت حاصل ہو جو دعوت کا عمل موثر طور پر جاری کرنے کے لئے ضروری ہے۔

آج بے شمار مسلمان "یوم فتح مکہ" منانے کے لئے بے قرار دکھائی دیتے ہیں۔ مگر "یوم صلح حدیبیہ" منانے کا شوق کسی کو نہیں۔ کیوں کہ صلح حدیبیہ ایک ایسا عمل ہے جو صبر کی قیمت مانگتا ہے۔ اور صبر کی قیمت دینے کے لئے کوئی تیار نہیں۔

امکانات

وزیر اعظم ہند مسٹر راجیو گاندھی نے جون ۱۹۸۵ میں امریکہ کا دورہ کیا تھا۔ اس موقع پر امریکہ میں "فیسٹول آف انڈیا" کا اہتمام کیا گیا۔ وہاں جو مختلف پروگرام کئے گئے ان میں سے ایک کی نگراں مس مورا موائنی ہن تھیں۔ ٹائمس آف انڈیا اور ہندستان ٹائمس (۸ جون ۱۹۸۵) میں مس مورا موائنی ہن کی ایک تصویر چھپی ہے۔ امریکی خاتون ایک ہندستانی لڑکی کو اپنے پاس بیٹھائے ہوئے ہیں۔ تصویر کے نیچے جو مضمون درج ہے اس کی چند سطریں یہ ہیں:

Maura Moynihan, who is fluent in Hindi, is one of the project coordinators for Aditi. Maura's father, Dr. Daniel Patrick Moynihan, is a former U.S. ambassador to India.

یعنی مورا موائنی ہن جو کہ روانی کے ساتھ ہندی بولتی ہیں وہ آدیتی پروگرام کی نگرانوں میں سے ایک ہیں۔ مورا ــــ ڈاکٹر ڈینیل پیٹرک موائنی ہن کی صاحبزادی ہیں جو کہ امریکہ کی طرف سے ہندستان کے سفیر رہ چکے ہیں۔

یہ واقعہ ہندستان میں ایک نئے دور کی آمد کی علامت ہے۔ آزادی سے پہلے ہندستان میں جو مغربی اشخاص آئے تھے ان کے بارے میں عام طور پر یہ پڑھنے میں آتا ہے کہ وہ رواں اردو بولتے تھے۔ اب مغرب کے جو افراد ہندستان آکر کچھ دن قیام کرتے ہیں ان کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ روانی کے ساتھ ہندی بولتے ہیں۔

آزادی سے پہلے مختلف تاریخی اسباب کی بنا پر یہ حال تھا کہ اردو بولنے والی قوم کو ممتاز درجہ حاصل تھا۔ باہر سے آنے والے لوگوں سے اس کا کافی ربط رہتا تھا۔ اردو زبان اور اردو قوم کی اہمیت اس وقت اتنی مسلم تھی کہ مغرب سے آنے والے لوگ اپنی کامیابی کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ وہ اردو زبان سیکھیں۔

اب صورت حال بدل گئی ہے۔ اردو بولنے والی قوم آزاد ہندستان میں ہر لحاظ سے غیر اہم

ہوگئی ہے۔ دوسری طرف ہندی بولنے والی قوم نے یہاں ہر اعتبار سے اہمیت کا درجہ حاصل کر لیا ہے چنانچہ مغرب کے نئے آنے والوں کا رابطہ اب ہندی بولنے والے گروہ سے قائم ہوتا ہے۔ وہ ہندستان آ کر انھیں کی زبان سیکھتے ہیں۔

اردو بولنے والوں نے مواقع سے فائدہ نہیں اٹھایا یہاں تک کہ قانون قدرت کے تحت وہ تمام مواقع سے محروم کر دیے گئے۔

قدیم ہندستان کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں دو حوالے نقل کئے جاتے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اپنے "اخبار" ہریجن" کی اشاعت ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۸ میں لکھا تھا:

"ہندو ایسے ہزاروں ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے اور جو بجا طور پر اردو کے عالم کہے جا سکتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے ڈاکٹر تیج بہادر سپرو ہیں۔"

دوسرا حوالہ سابق وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو کے شادی کارڈ کا ہے۔ پنڈت نہرو کی شادی ۱۹۱۶ میں ہوئی تھی۔ اس وقت ان کی شادی کا جو دعوت نامہ چھاپا گیا تھا وہ اردو زبان میں تھا۔ یہ دعوت نامہ آج بھی الہ آباد میوزیم کے نہرو سکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس دعوت نامہ کے الفاظ یہ تھے:

"تمنا ہے کہ بتقریب شادی برخوردار جواہر لال نہرو ساتھ دختر پنڈت جواہر مل کول بمقام دہلی بتاریخ ۷ فروری ۱۹۱۶ تقاریب مابعد تواریخ ۸ - ۹ فروری ۱۹۱۶ جناب مع عزیزان شرکت فرما کر مسرت و افتخار بخشیں۔

پنڈت موتی لال نہرو، آنند بھون، الہ آباد

واقفیت کی کمی

مالکم فوربس (Malcolm Forbes) کا ایک بہت بامعنی قول ہے۔ اس نے کہا کہ مسئلہ کا حل پیش کرنا ان لوگوں کے لئے بہت آسان ہے جو مسئلہ کے بارے میں بہت کم واقفیت رکھتے ہوں:

It's so much easier to suggest solutions when
you don't know too much about the problem.
The Sayings of Chairman Malcolm

انسان کی اجتماعی زندگی میں جب ایک مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی حیثیت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کانٹوں کے ڈھیر میں آدمی کے دامن کا الجھ جانا۔ ایسی حالت میں اگر آدمی بے سوچے سمجھے کھینچ تان شروع کر دے تو دامن اور زیادہ الجھ جائے گا اور اگر اس سے نکلے گا بھی تو پھٹ کر نکلے گا۔ ایسی حالت میں ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے کہ برداشت سے کام لیا جائے۔ صورت حال کا پورا اندازہ کر کے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی جائے۔

مگر جو شخص دور کھڑا ہوا ہو۔ جس کو صورت حال کی نزاکت کا پورا اندازہ نہ ہو وہ بے تکان بولے گا اور برجستہ حل پر حل پیش کرتا چلا جائے گا۔

اجتماعی زندگی ایک بے حد پیچیدہ چیز ہے۔ اجتماعی زندگی میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی بس یک طرفہ کارروائی کرنے لگے۔ اجتماعی زندگی میں اپنی اور دوسروں کی قوت کے تناسب کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں یہ کوشش کرنی پڑتی ہے کہ آخری حد تک دوسروں کے ٹکراؤ سے بچتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کیا جائے۔ اجتماعی زندگی میں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ فوری طور پر کیا چیز قابل حصول ہے اور وہ کیا چیزیں ہیں جس کے لئے ہمیں انتظار کی پالیسی اختیار کرنا چاہئے۔

جس شخص کو اجتماعی زندگی کی نزاکتوں کا احساس ہو وہ یقینی طور پر اجتماعی زندگی کے معاملہ میں بے حد حساس ہو جائے گا۔ وہ تجویز پیش کرنے سے پہلے اس کے بارہ میں ہزار بار سوچے گا۔ اس کے برعکس جس شخص کو مذکورہ بالا نزاکتوں کا احساس نہ ہو وہ بے تکان تجویزیں پیش کرے گا۔ اس کی بے حسی اس کے دماغ کو تجویزوں کا کارخانہ بنا دے گی۔

اسلوب بیان

غزوہ تبوک بڑے سخت حالات میں ہوا تھا۔ کچھ مسلمان اس میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ اس سلسلہ میں قرآن میں یہ آیت اتری:

ماکان لاھل المدینۃ ومن حولھم من الاعراب ان یتخلفوا عن رسول اللہ ولا یرغبوا بانفسھم عن نفسہ (التوبۃ)

مدینہ والوں اور اطراف میں رہنے والے دیہاتیوں کے لئے زیبا نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دیں، اور نہ یہ کہ اپنی جان کو رسول کی جان سے عزیز سمجھیں۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ایک مفسر قرآن لکھتے ہیں:

فھو وان کان فی ظاھرہ عاماً الا انہ خاص بمن کان قادراً علی حمل السلاح وصد طغیان العدو۔ ولیس لہ من العذر ما یمنعہ من الخروج

جہاد کے لئے نکلنے کا یہ حکم اگرچہ بظاہر عام ہے مگر حقیقۃً وہ اس شخص کے لئے خاص ہے جو ہتھیار اٹھانے پر قادر ہو اور دشمن کی سرکشی کو روک سکتا ہو۔ اس کے لئے کوئی ایسا عذر نہ ہو جو اس کو میدان جنگ کی طرف نکلنے سے روکے۔

اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ وہ جو بات فرما رہا ہے وہ خاص معنی میں ہے نہ کہ عام معنی میں۔ یعنی اس سے صاحب استطاعت افراد مراد ہیں نہ کہ سارے ہی افراد۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے قانونی اور منطقی زبان اختیار نہیں فرمائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قانونی اور منطقی زبان دعوتی مقصد کے لئے کار آمد نہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ "کون مجھے اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ وہ لوگوں سے سوال نہیں کرے گا اور میں اس کے لئے جنت کی ضمانت دیتا ہوں" بظاہر اس حدیث میں نہ ایمان کا ذکر ہے اور نہ عبادت کا۔ حالانکہ دونوں ضروری ہیں۔ مگر یہ کوئی کمی کی بات نہیں۔ کیوں کہ یہ دعوتی اور اصلاحی کلام ہے نہ کہ فقہی اور منطقی کلام۔

قانونی اور منطقی زبان میں اگرچہ قطعیت زیادہ ہوتی ہے۔ مگر یہ قطعیت اس قیمت پر حاصل کی جاتی ہے کہ دعوتی زور گھٹ جائے۔ داعی کا مقصد دلوں کو جھنجھوڑنا اور دماغوں کو متحرک کرنا ہے۔ اس لئے اس کے لئے دعوتی زبان ہی مفید ہے نہ کہ قانونی اور منطقی زبان۔

جدید انسان

امریکہ کے ایک کروڑ پتی کے بارہ میں ایک خبر پڑھی۔ خبر کا عنوان تھا اکتا کر جان دیدی (Bored To Death) اس عنوان کے نیچے خبر کے الفاظ یہ تھے :

The millionaire was tired, weary and bored. He called for his Lincoln continental limousine, got in, and said to the chauffeur: "James, drive full speed over the cliff. I've decided to commit suicide."

کروڑ پتی تھکا ہوا تھا۔ وہ افسردہ اور اکتایا ہوا تھا۔ اس نے اپنی قیمتی کار منگوائی۔ اس کے اندر بیٹھا۔ اور شوفر سے کہا "جیمز، ڈھلوان کے اوپر پوری رفتار سے گاڑی دوڑاؤ۔ میں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا ہے" (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ فروری ۱۹۸۵)

جن لوگوں کے پاس پیسہ کم ہو وہ بہت سے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ مسائل وہی ہیں جو پیسہ کی کمی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ان کے پاس پیسہ زیادہ آجائے تو ان کے تمام مسائل ختم ہو جائیں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح پیسہ کی کمی کے مسائل ہیں اسی طرح پیسہ کی زیادتی کے بھی مسائل ہیں۔ جس شخص کے پاس پیسہ کی افراط ہو جائے اس کے پاس مسائل کی بھی افراط ہو جاتی ہے حتی کہ اس کو سکون کے ساتھ رات کے وقت سونا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

اس دنیا میں پرسکون زندگی کا راز صرف ایک ہے۔ اور وہ وہی ہے جس کو مذہب کی زبان میں قناعت کہا جاتا ہے یعنی جو کچھ خدا نے دیا ہے اس پر صابر و شاکر رہنا۔ عدم اطمینان دراصل عدم قناعت کی نفسیاتی قیمت ہے۔ جو ہر اس آدمی کو بھگتنی پڑتی ہے جو خدا کی تقسیم پر راضی نہ ہو۔

عام انسان صرف یہ جانتا ہے کہ اس کا مصرف یہ ہے کہ وہ دولت کمائے۔ حالانکہ اگر دولت کمانا سب کچھ ہو تو دولت مند آدمی کبھی کسی مسئلہ سے دوچار نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت حاصل کرنے سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ زندگی کا علم حاصل کیا جائے۔ آدمی کو جینا آجائے تو وہ ہر حال میں سکون کے ساتھ جی سکتا ہے خواہ اس کے پاس کم پیسہ ہو یا زیادہ پیسہ۔

جدید تہذیب

امریکی میگزین نیوز ویک (۲۱ جنوری ۱۹۸۵) صفحہ ۳۵ پر ایک تصویر ہے۔ اس تصویر میں امریکی خواتین کا ایک جلوس دکھائی دے رہا ہے۔ جلوس کے آگے ایک نوجوان عورت ایک بینر اٹھائے ہوئے ہے۔ اس کے اوپر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے:

Keep your laws and your morality off my body

اپنے قوانین اور اپنے اخلاق کو میرے جسم سے دور رکھو۔

مضمون میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کے لوگ اس وقت دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک، وہ جو کھلے عام اسقاط کے قائل ہیں۔ یہ لوگ اپنے کو "اسقاط نواز" نہ کہہ کر اپنے کو انتخاب نواز (Pro-choice) کہتے ہیں۔ دوسرا گروہ جو اسقاط کا مخالف ہے۔ وہ اپنے آپ کو زندگی نواز (Pro-life) کہتا ہے۔

جدید مغربی مفکرین کا کہنا ہے کہ انھوں نے جو سب سے بڑی چیز دریافت کی ہے وہ آزادی ہے۔ مگر بے قید آزادی کا تجربہ جو جدید مغرب میں ہوا وہ بتاتا ہے کہ آزادی خیر اعلیٰ نہیں ہو سکتی۔ آزادی اگر خیر اعلیٰ ہو تو وہ اس قبیح انجام تک کیسے پہنچ جاتی ہے جس کا ایک نمونہ اوپر کے اقتباس میں نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آزادی بے حد قیمتی چیز ہے۔ مگر انسان کے لئے خیر اعلیٰ پابند آزادی ہے نہ کہ مطلق آزادی۔ یعنی انسان کے مقابلہ میں آزادی مگر خدا کے مقابلہ میں پابندی۔

انسان خدا اور بندے کے درمیان ہے۔ جہاں تک اپنے جیسے انسانوں کا تعلق ہے، ان کے مقابلہ میں بلاشبہہ ہر انسان کو کامل آزادی حاصل ہے۔ مگر اسی کے ساتھ دوسری شدید تر حقیقت یہ ہے کہ خدا کے مقابلہ میں انسان مکمل طور پر پابند ہے۔ خدا کے مقابلہ میں کسی انسان کو کوئی آزادی حاصل نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کو اپنی آزادی کا استعمال اس طرح کرنا ہے کہ وہ ہر حال میں خدا کے احکام کا پابند رہے۔ یہی پابندی آزادی کے صحیح استعمال کی ضمانت ہے۔

ایک سفر

مئی ۱۹۸۵ کے چند دن مغربی بنگال میں گزرے۔ ۲ مئی کی صبح کو میں آسنسول پہنچا۔ ۴ مئی کی صبح کو کلکتہ گیا اور اسی دن شام کو دہلی واپس آیا۔

آسنسول مغربی بنگال کا دوسرا سب سے بڑا تجارتی شہر ہے۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۴۰ فی صد ہے۔ یہاں ان کے دو عربی مدرسے اور دو اسکول ہیں۔ کالج کے قیام کی کوشش ہو رہی ہے تعلیم میں پیچھے ہونے کے باوجود مسلمان عام طور پر خوش حال ہیں۔ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان تعلقات اچھے ہیں۔ یہاں وہ فرقہ وارانہ تعصب نہیں پایا جاتا جو یوپی جیسے علاقوں کی خصوصیت ہے — ہندستان ایک ملک نہیں وہ کئی مختلف ملکوں کا مجموعہ ہے۔

آسنسول کی اقتصادیات براہ راست یا بالواسطہ طور پر کوئلہ سے وابستہ ہیں۔ یہاں کی اور اس کے آس پاس کی زمین کا زراعت کے لئے ناقص ہونا بتاتا ہے کہ اس کے نیچے خدا نے قیمتی کوئلہ کا خزانہ چھپا دیا ہے۔ جس کی اہمیت کی بنا پر اس کو "کالا سونا" کہا جاتا ہے۔ آدمی اگر اپنے آپ کو ایک پہلو سے کم پائے تو اسے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ دینے والے نے کسی دوسرے پہلو سے اس کو زیادہ دیا ہوگا۔

۲ مئی کو ۱۰ بجے ایک بنگالی افسر مسٹر ایس ایس چودھری اور دوسرے احباب کے ہمراہ کوئلہ کی ایک کان دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ہم لوہے کے ایک خانہ میں بیٹھے۔ اسٹیم انجن سے بندھی ہوئی لوہے کی رسی نے ہم کو کنویں جیسی گزرگاہ سے نیچے اتارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ہمیں ۶۰۰ فٹ نیچے کی تاریک دنیا میں پہنچا دیا۔ سطح زمین پر بظاہر ہم ایک چھوٹے سے کنویں میں داخل ہوئے تھے۔ مگر اندر پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہاں ایک پوری دنیا پھیلی ہوئی ہے۔

کوتیلری (کوئلہ کی کان) دیکھنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ اس کو دیکھ کر مجھ پر یہ تاثر ہوا کہ خدا کی حکمتیں بھی کیسی عجیب ہیں۔ سرسبز درختوں اور خوش نما پھولوں کو اس نے سطح زمین پر اگایا اور کالے کوئلہ کی فراہمی اس طرح کی کہ اس کو زمین کے نیچے قدرتی تہہ خانوں میں ذخیرہ کر دیا۔ اگر صورت حال اس کے برعکس ہوتی تو دیکھنے والوں کو یہ دنیا شاید کالے بھوت کی مانند نظر آتی۔

زمین کے نیچے جہاں کوئلہ نکالا جاتا ہے وہاں کوئلہ نکالنے کے بعد بڑے بڑے خلا پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس خلا کو پہلے یوں ہی چھوڑ دیا جاتا تھا مگر متعدد مقامات پر یہ زمینیں دھنس گئیں اور زبردست نقصان ہوا۔ اب ان خالی جگہوں کو ریت سے بھر دیا جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بہت چوڑے چوڑے پائپ اوپر سے اندر کی طرف لے جائے جاتے ہیں۔ ان پائپوں میں ریت پانی کے ساتھ ڈالی جاتی ہے اور ہوا کے دباؤ کے ساتھ اس کو نیچے کے گڑھوں میں پمپ کیا جاتا ہے۔ یہ بھیگی ہوئی ریت تیزی سے پائپ سے نکل کر خالی جگہوں میں بھر جاتی ہے اور سوکھ کر چٹان بن جاتی ہے۔

میں نے دیکھا کہ جو ریت بھری جا رہی ہے وہ اعلیٰ درجہ کی سرخ ریت ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس کام کے لئے اتنی اعلیٰ ریت کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے۔ انجنیر صاحب نے بتایا کہ یہ ریت ضائع نہیں ہو رہی ہے بلکہ وہ یہاں محفوظ ہو رہی ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ قدرتی عمل کے نتیجے میں وہ کسی زیادہ بہتر مادہ کی صورت میں ہمیں واپس ملے گی۔

شیشہ کا مشہور کارخانہ پلکنگٹن برادرز بالکل سونا اور بند نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ مزدوروں کی ہنگامہ آرائی کی وجہ سے وہ عرصہ سے بند پڑا ہوا ہے۔ اس علاقہ کے بہت سے کارخانوں کا آجکل یہی حال ہے۔ مغربی بنگال کا یہ علاقہ ملک کا اہم ترین صنعتی علاقہ ہے۔ اس علاقہ میں کثرت سے کارخانے ہیں۔ مگر ٹریڈ یونین کی منفی سیاست نے اکثر کارخانوں کے مالکوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کو بند کر دیں یہ ٹریڈ یونینیں کمیونسٹ لیڈروں کے ماتحت ہیں۔ ان لیڈروں کی غیر سنجیدگی اسی سے ظاہر ہے کہ اشتراکی ملک میں مزدوروں کا ہڑتال کرنا ان کے نزدیک سب سے بڑا جرم ہے۔ مگر جمہوری ملک میں مزدور کا ہڑتال کرنا ان کے نزدیک سب سے بڑی نیکی بن جاتا ہے۔

آسنسول کا شہر حکومت کے لئے زبردست آمدنی کا علاقہ ہے۔ مگر اس کی سڑکیں اور محلے گندگی کا نمونہ پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آسنسول اقتصادی اعتبار سے اس پوزیشن میں ہے کہ وہ کسی بھی ترقیاتی منصوبہ کی قیمت ادا کر سکے۔ اس کے باوجود آسنسول کی موجودہ حالت یا تو سرکاری غفلت کی وجہ سے ہے یا سرکاری کرپشن کی وجہ سے۔

یہاں ایک عیدگاہ اسکول ہے۔ یہ نام اس لئے ہے کہ وہ عیدگاہ کے ایک طرف تعمیرات کر کے اس کے اندر قائم کیا گیا ہے۔ ۲ مئی کو میں نے اسے دیکھا اور یہاں مختصر خطاب کیا۔ ملک میں بے شمار

عید گاہ ہیں۔ مگر وہ سال بھر خالی پڑی رہتی ہیں۔ سال میں صرف دو بار ان میں عیدین کی نماز ہوتی ہے مجھے عید گاہ کا یہ انداز پسند آیا کہ اس کے کنارے مدرسہ یا اسکول بنا کر اس کو مستقل استعمال کی چیز بنا دیا جائے۔

آسنسول میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مسلمانوں کا نوجوان طبقہ تعمیری کاموں کی طرف متوجہ ہے۔ مسجد میں امام اور موذن کے معیار کو بہتر بنانا، مدرسہ کو ترقی دینا، لائبریری قائم کرنا، قوم کے مختلف حلقوں کو جوڑنا، نوجوان نسل کو دینی اور تعمیری رخ پر ڈالنے کی کوشش کرنا۔ یہ مناظر یہاں کے قیام کے دوران واضح طور پر نظر آئے۔

مجھے یہاں مدرسہ مصباح العلوم کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے بلایا گیا تھا۔ مدرسہ کے سکرٹری جناب سمیع الدین صاحب نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ یہ مدرسہ ۱۹۱۲ میں قائم ہوا۔ اس میں مقامی طلبہ کے علاوہ بیرونی طلبہ تقریباً ایک سو زیر تعلیم ہیں۔ اس کا طریقہ تعلیم درس نظامیہ کے نصاب پر مبنی ہے۔ فی الحال اس مدرسہ میں عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم سے لے کر مشکوٰۃ تک تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ حفظ اور قرأت کی تعلیم کا بھی معقول انتظام ہے۔ اس کے تحت بارہ اساتذہ کام کر رہے ہیں۔ مدرسہ میں ایک دارالافتاء بھی ہے۔ مدرسہ کا پرائمری سکشن حکومت بنگال سے منظور شدہ ہے۔ اس سکشن میں طلبہ کی تعداد ۲۵۰ ہے۔ شہر کے مختلف محلوں میں مدرسہ کی پانچ شاخیں قائم ہیں جن میں طلبہ کی تعداد مجموعی طور پر ۸۰۰ ہے۔

مدرسہ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر جو وسیع ڈائس تیار کیا گیا تھا اس میں ایک پرکشش چیز یہ دکھائی دی کہ ڈائس کے دونوں طرف الرسالہ کے صفحہ اول کے دو مضامین جلی حرفوں میں لکھ کر لگائے گئے تھے۔ یہ دونوں مضامین (مقولے) حسب ذیل تھے:

بلند مقام ہمیشہ اپنے آپ کو بلند کرنے سے ملتا ہے نہ کہ نعرے اور جھنڈے کو بلند کرنے سے

الرسالہ اگست ۱۹۸۴

دوسروں سے نہ لڑنے کے لئے اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے۔

الرسالہ اکتوبر ۱۹۸۴

اس قسم کا کام یہاں نوجوانوں کی ایک ٹیم کر رہی ہے جو حال میں ابھری ہے۔ ایک صاحب نے بتایا

کہ یہاں کے نوجوانوں میں جو تعمیری رجحان ابھرا ہے اس میں الرسالہ کا خاص دخل ہے۔ یہاں الرسالہ کے پڑھنے والے کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اکثر مقامات پر دینی پرچوں میں اب الرسالہ ہی سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ الرسالہ اب خدا کے فضل سے دور حاضر میں مسلمانوں کی حقیقی بیداری کی علامت بنتا جا رہا ہے۔

منتظمین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ ہم نے جب مدرسہ کے سالانہ اجلاس کے لئے آپ کو بلانے کا فیصلہ کیا تو ہم اس شبہ میں تھے کہ جلسہ کامیاب ہوگا یا نہیں۔ کیوں کہ ہم کو معلوم تھا کہ آپ عوامی انداز کے مقرر نہیں ہیں۔ آپ کے نام پر شاید بہت زیادہ لوگ جمع نہ ہو سکیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ ۲ مئی ۱۹۸۵ کی شام کو نذرل منچ میں راقم الحروف کا خطاب عام ہوا تو وسیع منچ پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ یہاں کے ایک صاحب نے مزید بتایا کہ صرف ایک مہینہ پہلے یہ واقعہ ہوا کہ کلکتہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس (اپریل ۱۹۸۵ کا پہلا ہفتہ) کے بعد بعض انتہائی ممتاز شخصیتیں یہاں آئیں اور آسنسول میں ان کا خطاب عام ہوا مگر موجودہ مجمع کے مقابلہ میں بمشکل نصف مجمع ان کے خطاب میں شریک ہو سکا۔

یہ واقعہ اس بات کی علامت ہے کہ الرسالہ کی آواز تیزی سے لوگوں کے ذہنوں کو کھینچ رہی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب کہ الرسالہ کی آواز ہی انشاء اللہ وقت کی غالب آواز بن جائے گی۔

آسنسول میں قیام کے دوران بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اس طرح کی ملاقاتوں میں اکثر لوگ "مسائل عالم" پر گفتگو کرتے ہیں۔ مگر میری ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ آدمی کے شخصی تجربات کو جانوں کیونکہ شخصی تجربات میں حقیقی سبق ہوتا ہے۔ جب کہ مسائل عالم کی بحثیں الفاظ کی بے فائدہ نمائش کے سوا اور کچھ نہیں۔

آسنسول میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے ایک حاجی محمد مبین صاحب (پیدائش ۱۹۲۰) تھے۔ وہ ہارڈویر کے تاجر ہیں۔ اس میدان میں ان کو کافی تجربہ ہے۔ میں نے پوچھا کہ آجکل ایک بہت بڑا مسئلہ نقلی سامانوں کا ہے۔ آپ کسی نقلی سامان کو کس طرح پہچانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ واقعہ ہے کہ آجکل ہندستان کے بازار نقلی سامان سے بھرے ہوئے ہیں۔ عام خریداران سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ مگر ہمارے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم چیز کو دیکھ کر یا دانت سے دبا کر یا اس کی آواز سن کر پتہ کر لیتے ہیں کہ یہ اصلی ہے یا نقلی۔

انھوں نے ۲۰ سال پہلے کا اپنا ایک واقعہ بتایا۔ ان کو لوہے کی چادر (Galvanized sheet) کی ضرورت تھی۔ اس کو خریدنے کے لئے وہ کلکتہ گئے۔ وہاں وہ ایک دکاندار کے یہاں پہنچے۔ اس نے چادر دکھائی اور اس کا دام ۵۵ روپیہ فی چادر بتایا (اب اس قسم کی چادر کا دام ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ ہے)

کلکتہ کے دوسرے دکاندار اس چادر کا دام ۵۶ روپیہ فی شیٹ بتا رہے تھے۔ محمد مبین صاحب کم قیمت پر خوش نہیں ہوئے۔ بلکہ انھیں شبہ ہوا کہ یہ آخر سستی کیوں ہے۔ انھوں نے دکاندار سے کہا کہ بازار میں اس چادر کا دام ۵۶ روپیہ ہے۔ پھر تم ۵۵ روپیہ کیسے کہہ رہے ہو۔ مجھے صفائی سے بتاؤ کہ اس فرق کا راز کیا ہے۔ دکاندار نے پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ آخر اصرار کے بعد اس نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ چادر کا اسٹینڈرڈ سائز ۲۶ انچ ہے۔ مگر یہ چادر ۲۵ انچ ہے یعنی ایک انچ کم۔

میں نے محمد مبین صاحب سے کہا کہ عام مزاج کے مطابق آپ کو یہ کرنا چاہئے تھا کہ سستا پاکر اسے فوراً لے لیتے۔ پھر آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ میرے دل میں آیا کہ ضرور اس کے اندر کوئی کمی ہے۔ ورنہ یہ اس کو سستا کیوں دے رہا ہے۔ مال کا سستا ہونا مجھے مال کے اندر خرابی کی علامت نظر آیا۔ چنانچہ محمد مبین صاحب نے سستی چادر چھوڑ دی۔ اور دوسرے دکاندار کے یہاں جاکر مہنگی چادر خریدی۔ جب آدمی کسی معاملے میں پوری طرح سنجیدہ ہو تو اس کا طریقہ یہی ہوتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ہمارے لیڈروں کا حال بھی یہی ہے۔ وہ ملت کی تعمیر کے سستے نسخے پیش کر رہے ہیں اور بہت سے لوگ ان سستے نسخوں کی طرف تیزی سے دوڑ رہے ہیں۔ مگر یہ واقعہ صرف یہ بتاتا ہے کہ لیڈر اور ان کے پیرو دونوں میں سے کوئی بھی سنجیدہ نہیں۔ اگر وہ فی الواقع اس معاملے میں سنجیدہ ہوتے تو سستے نسخوں کی اصلیت پر شبہ کرتے نہ یہ کہ ان کو لے کر فوراً دوڑنے لگیں۔

آسنسول کی ایک تقریر میں میں نے کہا کہ اس ملک کے مسلمانوں کی پسماندگی کی وجہ یہ ہے کہ ان کے لیڈر انھیں رزرویشن کا سبق دیتے رہے۔ مگر یہ مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں اہلیت کا ثبوت دے کر کسی کو جگہ ملتی ہے۔ رزرویشن کی باتیں کرنا محض ایک قیادتی فریب ہے۔ کیوں کہ اس طرح کچھ لوگوں کو سستی قیادت تو مل سکتی ہے۔ مگر اس طرح اصل مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

ایک صاحب نے فرمایا کہ ہمارے سامنے ایسے واقعات ہیں کہ ایک مسلمان کے پاس اچھے نمبر تھے، اس کے باوجود اسے ملازمت نہیں ملی۔

جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں انھیں معلوم نہیں کہ اس قسم کی شکایتیں خود اکثریتی فرقہ کے افراد کو بھی ہیں۔ مثلاً گجرات میں پس ماندہ فرقوں کے لئے ۳۱ فی صد کا رزرویشن تھا۔ مگر اس سے ان کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۸۵ میں ان کے لئے ۴۹ فی صد رزرویشن کا اعلان کیا گیا۔ گویا کالجوں اور سرکاری ملازمتوں میں ۴۹ فی صد سیٹیں مقابلہ کے بغیر پس ماندہ طبقات کے لئے مخصوص کر دی گئیں اس پر گجرات کی راجدھانی احمد آباد میں زبردست فساد پھوٹ پڑا۔ غیر پس ماندہ فرقے پس ماندہ فرقوں کے خلاف جنگ پر آمادہ ہوگئے۔ امریکہ کے میگزین نیوز ویک کے نمائندہ نے احمد آباد کا دورہ کیا۔ وہاں گفتگو کے دوران اکثریتی فرقہ کے نوجوانوں نے عین وہی جملہ کہا جو مسلمان نوجوان عام طور سے کہتے ہوتے سنے جاتے ہیں۔ نیوز ویک (۶ مئی ۱۹۸۵) کی رپورٹ کے مطابق ایک طالب علم نے کہا کہ ہم ۸۵ فی صد نمبر لاتے ہیں پھر بھی ہمیں داخلہ نہیں ملتا:

The lower castes get 35 percent on their examinations and get into (government) service. We get 85 percent and do not get in.

۴ مئی کی صبح کو آسنسول سے کلکتہ گیا۔ کم وقت کی وجہ سے وہاں زیادہ پروگرام نہ رکھے جاسکے۔ تاہم اسلامیہ ہال میں "اسلام اور عصر حاضر" کے موضوع پر ایک خطاب ہوا۔ اخبار مشرق کے نمائندوں سے ملاقات ہوئی اور مدرسہ باب العلوم کا معائنہ کیا۔ وغیرہ۔

مدرسہ باب العلوم تقریباً دس سال سے قائم ہے۔ مدرسہ کے بانی قاری محمد اسمٰعیل ظفر صاحب کے والد تھے۔ وہ ایک درویش صفت بزرگ تھے۔ وہ اینٹ کا تکیہ لگا کر سوتے تھے۔ کھانا اور کپڑا ایسے معمولی استعمال کرتے تھے۔ ان کے صاحبزادہ نے ایم اے کیا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی جدید ادارہ میں کام کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کے والد نے اصرار کیا کہ تم کو مدرسہ والا کام کرنا ہے۔ سعادت مند صاحبزادہ نے والد کی بات کے آگے سپر ڈال دیا اور مدرسہ کے کام میں لگ گئے۔

مدرسہ باب العلوم ایک غیر معروف مدرسہ ہے۔ کلکتہ کے موجودہ سفر سے پہلے مجھے مدرسہ کے بارہ میں مطلق کوئی واقفیت نہ تھی اور نہ میں اس مدرسہ کے ذمہ داروں کے نام سے واقف تھا۔ مگر معائنہ کے دوران معلوم ہوا کہ ابتدائی سطح پر یہ ایک معیاری دینی مدرسہ ہے۔ ان کے پاس زیادہ بڑی جگہ نہیں۔ مگر عالم یہ ہے کہ اس وقت سات سو طلبہ کی درخواست داخلہ "ویٹنگ لسٹ" پر ہے۔ مگر جگہ کی کمی کے

باعث وہ ان کو نہیں لے سکتے۔

اس تجربہ کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے تاریخ اسلام کے ایک سوال کا جواب پالیا ہے۔ اسلامی تاریخ کی کتابوں میں اس بات کی تفصیل نہیں ملتی کہ تاریخ اسلام کے بعض بہت بڑے بڑے واقعات کس طرح ظہور میں آئے مثلاً دور اول میں ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں اسلام کی اشاعت، تاتاریوں کا مسلمان ہونا۔ کتابوں سے واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ واقعات کن لوگوں کے ذریعہ اور کس طرح وقوع میں آئے۔

ان واقعات کے غیر مذکور ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ غیر مشہور لوگوں کے ذریعہ انجام پائے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جو لوگ سیاسی انداز سے کام کرتے ہیں یا جن کا حکمرانوں سے ٹکراؤ پیش آتا ہے وہ بہت جلد شہرت عام حاصل کر لیتے ہیں۔ اشاعت اسلام کے میدان میں کام کرنے والے یہ لوگ چونکہ سیاست و حکومت سے الگ تھے اس لئے وہ غیر مشہور رہ گئے اور اسی طرح ان کے کام کی تفصیلات بھی۔

اکثر زیادہ بڑا کام کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو بظاہر دیکھنے والوں کو بہت چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔

آسنسول اور کلکتہ میں جو گفتگوئیں اور تقریریں ہوئیں۔ ان کا موضوع مشترک طور پر یہ تھا کہ دور جدید میں ہم کو ایک نئے چیلنج کا سامنا ہے۔ اس کا مقابلہ نہ روایتی وعظ سے کیا جا سکتا ہے اور نہ پرجوش خطابت سے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم ایک طرف اسلام کو اس کی اصل حیثیت میں جانیں اور دوسری طرف عصر حاضر کو گہرائی کے ساتھ سمجھیں۔ دونوں کو بخوبی طور پر جاننے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ دور جدید میں اسلام کو اور مسلمانوں کو اٹھانے کی موثر جد وجہد کی جا سکے۔

نذرل منچ مشہور بنگالی شاعر قاضی نذرالاسلام کے نام پر حکومت نے قائم کیا ہے۔ یہاں کے اجتماع میں غیر مسلم افراد بھی قابل لحاظ تعداد میں موجود تھے۔ اس مناسبت سے میں نے اس موقع پر اسلام کا اساسی اور عمومی تعارف پیش کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کسی کے لئے بھی اجنبی نہیں۔ وہ ہر آدمی کی فطرت کی آواز ہے۔ اسلام کو اگر مسلمانوں کی قومی سیاست (زیادہ صحیح لفظوں میں جھوٹی سیاست) سے الگ کر دیا جائے تو ہر آدمی محسوس کرے گا کہ اسلام اس کی اپنی چیز ہے، وہ کسی غیر کی چیز نہیں۔

آسنسول میں پروگرام

۲ مئی ۱۹۸۵	۹ بجے صبح	کوئلہ کی کان کا مشاہدہ
		کوئیلری کے بعض ذمہ داروں سے ملاقات
		عیدگاہ ہائی اسکول کا معائنہ اور خطاب
	۶ بجے شام	پریس کانفرنس سے خطاب
	۹ بجے رات	جلسہ دستار بندی کی صدارت
		اجتماع عام سے خطاب
۳ مئی ۱۹۸۵	۹ بجے صبح	مذاکرہ (اسلام اور عصر حاضر)
	۱۲ بجے	جامع مسجد میں خطاب
	۲ بجے	اردو لائبریری کا سنگ بنیاد
		اردو زبان پر تقریر
	۸ بجے شام	خواتین کے اجتماع سے خطاب
	۱۰ بجے رات	خطاب عام نذرل منچ میں

کلکتہ میں پروگرام

۴ مئی ۱۹۸۵	۱۰ بجے صبح	مدرسہ باب العلوم کا معائنہ اور ملاقاتیں
		اخبار مشرق کے نمائندہ سے ملاقات
		اسلامیہ ہال میں خطاب

نوٹ : کلکتہ کا پروگرام ضمناً رکھا گیا تھا۔ یہ سفر اصلاً آسنسول کے لئے ہوا تھا۔

۴ مئی ۱۹۸۵ کی شام کو انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۰۲ کے ذریعے میں کلکتہ سے دہلی آ رہا تھا کہ راستہ میں عجیب واقعہ پیش آیا جو میرے لئے پہلا تجربہ تھا۔ ہمارا ہوائی جہاز کلکتہ اور دہلی کے درمیان تھا کہ اچانک وہ سخت ہچکولے کھانے لگا۔ اس کی کیفیت ایسی ہوگئی جیسے کوئی کار ایسی سڑک سے گزر رہی ہو جہاں بہت بڑے بڑے گڑھے ہوں اور کار اس میں نیچے اوپر ہونے لگے۔ بار بار جہاز اتنی تیزی سے نیچے جاتا جیسے کہ وہ زمین پر گر پڑے گا۔

یہ کیفیت تقریباً ۲۰ منٹ تک رہی۔ جہاز کے مسافروں میں عجیب بے چینی پھیل گئی۔ میرے قریب کے ایک "وی آئی پی" مسافر بار بار جہاز کے عملہ سے ہاتھ کے اشارہ سے پوچھتے تھے اور کہتے تھے How long یعنی یہ کب تک رہے گا۔ تاہم جہاز کا اسٹاف مطمئن تھا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ یہ وقتی ہے اور جہاز کچھ دیر کے بعد ہموار ہوائی سطح پر چلنے لگا۔

معمولی طور پر تو جہاز میں اس طرح کے جھٹکے اکثر ہوتے ہیں مگر موجودہ طرز کے شدید جھٹکے صرف کبھی کبھی پیش آتے ہیں۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہوا میں قدرتی گڑھے ہیں۔ جب ہوائی جہاز وہاں پہنچتا ہے تو وہ اچانک اس کے اندر گر پڑتا ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے بلیرڈ کی گیند ایک دم سے تھیلی میں آ گرتی ہے۔ اسی بنا پر اس کو ہوا تھیلی (Air pocket) کہا گیا۔

مگر جدید تحقیقات بتاتی ہیں کہ یہ موسمی اثرات کا نتیجہ ہے۔ ہوا کی حرکت عام طور پر افقی ہوتی ہے۔ مگر بعض اسباب کے تحت کسی خاص مقام پر اس کی حرکت عمودی (نیچے اوپر) ہونے لگتی ہے۔ یہ کیفیت دو میل نیچے اوپر تک ہو سکتی ہے۔ جب جہاز ایسے مقام پر پہنچتا ہے تو وہ ہوا کے ساتھ اچانک تیزی سے نیچے اوپر ہونے لگتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین پر گر پڑے گا۔ اس کیفیت کا زیادہ جدید نام Updraft and downdraft ہے۔

دہلی ملک کی راجدھانی ہے۔ اس لئے ہندستان کے ہر حصہ سے روزانہ لاکھوں افراد دہلی آتے ہیں۔ ان میں ایک تعداد وہ بھی ہوتی ہے جو الرسالہ اور اسلامی مرکز کے مشن سے واقف ہے۔ یہ لوگ جب دہلی آتے ہیں تو وہ ملاقات کے لئے اسلامی مرکز بھی آتے ہیں۔ یہ سلسلہ تقریباً روزانہ جاری رہتا ہے۔ اس سے برابر اندازہ ہوتا رہتا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں اسلامی مرکز اور الرسالہ کے مشن کا ردعمل کیا ہو رہا ہے۔ خدا کے فضل سے ملک کے ہر حصہ میں الرسالہ تیزی سے پھیل رہا ہے۔ حتی کہ وہ لوگ بھی اہتمام کے ساتھ الرسالہ پڑھتے ہیں جو بظاہر الرسالہ سے غیر متعلق ہیں۔ مہاراشٹر سے آنے والے ایک نوجوان نے بتایا کہ ایک بار انھوں نے اپنے یہاں کے ایک عالم کو دیکھا کہ وہ اپنی تقریر میں الرسالہ کے مضامین بیان کر رہے ہیں۔ حالانکہ بظاہر وہ اپنے آپ کو الرسالہ سے بے تعلق ظاہر کرتے تھے۔ نوجوان نے پوچھا کہ یہ باتیں جو آپ نے بیان کیں یہ سب تو الرسالہ کی باتیں ہیں۔ مذکورہ عالم نے کسی قدر پس وپیش کے بعد اقرار کیا کہ وہ الرسالہ پابندی سے پڑھتے ہیں۔ ہزاروں لوگ ہیں جو اپنی گفتگوؤں، تقریروں اور تحریروں میں الرسالہ کے مضامین نقل کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ اس کا حوالہ نہیں دیتے۔ اسی طرح ہر جگہ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو الرسالہ کی پرزور مدافعت کر سکیں۔ برار سے آنے والے ایک صاحب نے بتایا کہ ان کے علاقہ میں کچھ لوگوں نے الرسالہ کے خلاف بے بنیاد پروپگنڈا شروع کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ آپ نے ابھی تک الرسالہ کو سمجھا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ الرسالہ کے مضامین کو نچوڑیں تو اس سے صرف درد ٹپکے گا۔

الرسالہ خدا کے فضل سے ہر حلقہ اور ہر علاقہ میں کثرت سے پڑھا جانے لگا ہے۔ اس کا ایک اندازہ روزانہ کی ڈاک سے ملنے والے خطوط سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر شری منگل سین (دہلی) اپنے خط مورخہ ۴ اپریل ۱۹۸۵ میں لکھتے ہیں: آپ کا ماہنامہ الرسالہ باقاعدگی سے دستیاب ہوتا ہے۔ اور جب یہ پہنچتا ہے تو سارے کام چھوڑ کر اس پر جھپٹ پڑنے کو جی چاہتا ہے۔ کسی سے بات چیت ہو رہی ہو تو فوراً ختم کر کے اس کو پڑھنا شروع کر کے تسکین حاصل ہوتی ہے۔

بلاشبہہ خدا نے آپ کے قلم میں وہ روانی عطا کی ہوئی ہے کہ جس سے ہمارے پاٹھکوں کو تو بہت آنند آتا ہے۔ گویا یہ تحریر کسی خداشناس کی معلوم پڑتی ہے۔ کچھ وقت پہلے آدرنیہ شاستری کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور اپنے مشن کی لائبریری کے لئے الرسالہ کے پرانے پرچے لینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ براہ کرم قیمت سے مطلع کریں تاکہ کسی کو بھیج کر منگوائے جاسکیں۔

۳ مسٹر ایس۔ ایس بھٹناگر (غازی آباد) اپنے خط مورخہ ۲۱ مئی ۱۹۸۵ میں لکھتے ہیں: کل رات کے وقت جیسے ہی میرے لڑکے نے آپ کا الرسالہ اپنے چھوٹے ہاتھوں سے پیش کیا تو میرا دل باغ باغ ہوگیا اور انھیں جذبات سے معمور ہوکر دل سے آپ کے لئے دعا نکلی کہ آپ کو خدا تعالیٰ اپنی رحمتوں سے ہمیشہ نوازتے رہیں۔ دور حاضر میں تو آپ ہی واحد بندہ ہیں جو اسلام کو حقیقی معنوں میں عوام کے سامنے خداوند کریم کے فضل سے بخوبی پیش کر رہے ہیں۔ ویسے تو بہت سے اشخاص اس ضمن میں خدمت دین میں مصروف ہیں۔ تاہم آپ کا انداز بیان منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ بخدا خاکسار آپ کے الرسالہ سے بہت فیض یاب ہوا ہے۔ مزید برآں لاکھوں اشخاص آپ کی تحریر کردہ مطبوعات سے مستفیض ہوتے ہیں۔ خدا کرے آپ ہماری راہ نمائی اسی طرح برسہا برس کرتے رہیں۔

۴ ۲۸ جون ۱۹۸۵ کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔ حسب معمول مرکز میں ماہانہ درس کا پروگرام ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے قرآن کی آیت وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ کی روشنی میں درس دیا۔ موصوف نے بتایا کہ موجودہ زمانہ میں لسان قوم (عصری انداز کلام) کیا ہے۔ اور اس عصری انداز کلام میں قرآن کی دعوت کو کس طرح پیش کیا جانا چاہئے۔ اس درس کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے۔

۵ بمبئی کے اجتماع (مئی ۱۹۸۵) کا تذکرہ وہاں کے اخبارات نے اہتمام کے ساتھ کیا۔ اس سلسلہ میں ہفتہ وار بلٹز (یکم جون ۱۹۸۵) نے حسب ذیل الفاظ لکھے: مولانا وحید الدین خاں کو بھلا کون نہیں جانتا۔ الرسالہ جیسے دینی اور علمی پرچے سے انھوں نے سارے ہندستان میں دھوم مچا رکھی ہے۔ مولانا نے خاص طور سے عصر جدید، سائنس اور اسلام کے تعلق سے معرکۃ الآرا کتابیں لکھی ہیں۔ یہ بات بالکل سچی ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر کتابیں آج تک

نہیں لکھی گئیں۔ اسی لئے مولانا کی کتابیں اسلامی ممالک کی کئی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل کرلی گئی ہیں۔ نیز ان کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں کیا جاچکا ہے۔ مولانا وحید الدین کی اپنی ایک سوچ ہے اور اپنا ایک انداز فکر۔ وہ ٹکراؤ کی پالیسی پر عمل نہیں کرتے لیکن مصلحت پرستی کا شکار بھی نہیں۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کی ہمت بڑھاتے ہیں۔ حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے۔ زندگی کے تلخ وشیریں تجربات کا سامنا کرنے کے لئے۔

گزشتہ دنوں مولانا وحید الدین نے بمبئی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ مولانا نے اپنے انوکھے مگر کارآمد مقصد کے حصول کے لئے ۱۹۷۰ میں نئی دہلی میں اسلامک سینٹر کی بنیاد ڈالی تھی۔ اب مولانا محترم نے اپنے مقبول ترین جریدہ (الرسالہ) کو انگریزی کا روپ بھی دے دیا ہے تاکہ ان کا مشن تیز تر ہوسکے (اخبار بلٹز بمبئی)

ایک صاحب بمبئی سے لکھتے ہیں: رتنا بائی ہال (بمبئی) میں آپ کا جو پہلا لکچر (۱۶ مئی ۱۹۸۵) ہوا تھا، میں نے اس کا ترجمہ ہندی میں کیا ہے۔ جو ترقی پسندوں کے ایک پرچہ "چنتن وشا" میں خصوصی اہتمام سے چھپا ہے۔ اس کو غیر مسلم ترقی پسند طبقہ نے بھی بہت پسند کیا ہے۔ ان کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ اس سے پہلے اسلام کی تشریح میں اور مومن کی علامت کی وضاحت میں اس قسم کا کوئی ہندی مضمون یا تقریر ان کی نظر سے نہیں گزری۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور تادیر آپ کا سایہ ہم لوگوں کے سر پر قائم رکھے۔

جون ۱۹۸۵ میں اسلامی مرکز میں تشریف لانے والوں میں سے جناب سید ہاشم علی صاحب (وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) تھے۔ موصوف الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ الرسالہ کے تعمیری پیغام سے پوری طرح اتفاق رکھتے ہیں۔ موصوف تقریباً ایک گھنٹہ مرکز میں رہے۔ انھوں نے مرکز کے کاموں کی باقاعدگی کو خصوصیت سے پسند فرمایا۔

پونہ سے جناب عبد الصمد شیخ اطلاع دیتے ہیں: یہاں الشبان المسلمون نے اپنی سالانہ کارکردگی کی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس میں آپ کی ایک تاریخی تقریر بھی شامل ہے۔ یہ تقریر ۷ مارچ ۱۹۸۳ کو بعد نماز مغرب الشبان المسلمون کے دفتر میں ہوئی تھی اور پھر ٹیپ کی مدد سے مرتب کی گئی۔ پونہ کے تعلیم یافتہ حلقہ میں آپ کی یہ تقریر بڑی دلچسپی سے پڑھی جارہی ہے۔ یہ تقریر مذکورہ رپورٹ میں صفحہ ۱۷ تا ۲۵ پر درج ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ
کیسٹ

الرسالہ کیسٹ کی روانگی شروع ہوگئی ہے

انفرادی خریدار اطلاع بھیج کر جلد اپنی خریداری درج کرادیں۔

جو حضرات اس کی ایجنسی لینا چاہیں

وہ بھی اپنی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں۔

الرسالہ کیسٹ کی ایجنسی کم از کم پانچ کیسٹوں پر دی جائے گی۔

کمیشن :

۲۵ کیسٹ تک — ۲۰ فی صد

۲۵ کیسٹ سے زیادہ — ۲۵ فی صد

(ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ)

الرسالہ کیسٹ

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دھلی ۱۱۰۰۱۳

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

September 1985
Number 106

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

الرسالہ
کیسٹ

ماہانہ کیسٹ سیریز

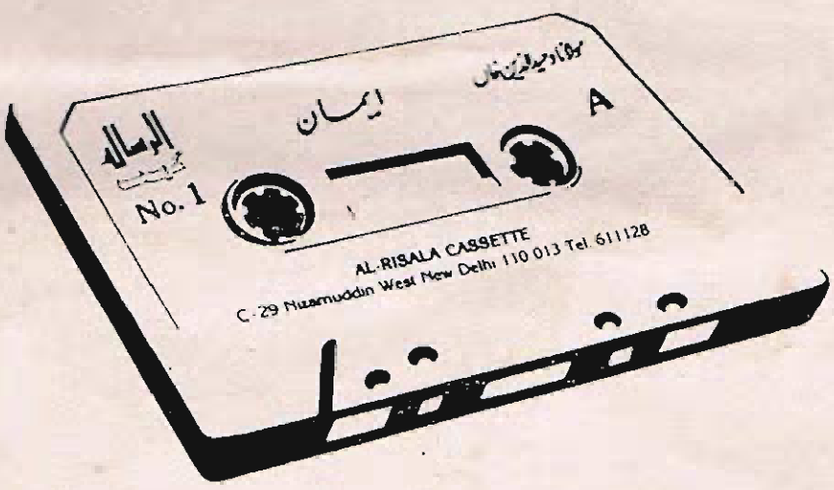

عصری اسلوب میں
اسلامی تعلیمات

مولانا وحید الدین خاں کی آواز میں

ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ　　ششماہی (۶ کیسٹ) ۱۴۰ روپیہ　　سالانہ (۱۲ کیسٹ) ۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے ۵ ڈالر امریکی　　۲۵ ڈالر امریکی　　۵۰ ڈالر امریکی

مزید معلومات کے لیے لکھیں
الرسالہ کیسٹ
سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

AL-RISALA CASSETTE C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013